

مہینہ

بیان

الحمد

ترکی

اشیقی
ہسندی
امیرکن
جرمن
ہسپانوی
فرانسیسی
اور
یونانی

لعارف، ترجمہ، انتخاب:
مرزا حامد پیغمبر

فکشن سے انتخاب

مہینہ
بیان

ماہنامہ پوچھ

اگست ۱۹۵۴ء

جلد نمبر ۶ شمارہ نمبر ۸

مدیر اعلیٰ:
آغا امیر حسین

بچلیں مشاورتے (اعزازی):
ملک، مراجع خالد، سید و فضل حیدر
ڈاکٹر محمد عاصی لقی جنپر (ر) دلاؤ مخموٰ
ڈاکٹر خاں الارمڈ ہوئی۔ خلش علوی، سعید سالمی
سید عبد القados، یونس رویب، پرویز حمید، اسلام کمال
نائب مدیر: مدیر منظم:
سید راشد سیر کاغذ * سید نذیم سیر کاغذ

قیمت ۰/۱۸ روپے

زرسالانہ عام داک سے ۲۰٪ روپے
زرسالانہ بذریعہ بسروڑاک سے ۲۵٪ روپے
ایڈیٹر، پبلیشر آغا امیر حسین نے
تفییض پر طرز سے چھپو اکرشام کیا۔

راپطہ: ماہنامہ پوچھ چوک گل، دی مال، لاہور۔ ۵۳...۵۴

فون: ۰۳۱۲۹۶۶ - ۰۳۱۲۹۶۲ - ۰۳۱۲۹۶۳ - ۰۳۱۲۹۶۴ نیکس: ۰۳۱۲۸۲۳۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

میرا صفحہ

یوں تو اردو زبان میں مغربی دنیا کی کمانیوں کے بے شمار ترجمے شائع ہو چکے ہیں اور ہوتے رہیں گے ان میں اعلیٰ معیار کے شاہکار افسانے بھی شامل ہیں اور سننی خیز، جنسی اور جاسوسی کمانیوں کے تراجم بھی۔ زیادہ تر کمانیاں "ڈا ججٹ" رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ چینی، روی، فرانسیسی کمانیوں کے تراجم اپنے مخصوص سماجی پس منظر کے ساتھ خال نظر آتے ہیں۔

ماہنامہ سپوٹک رسائل و جرائد کی دنیا میں ایک بالکل مختلف انداز میں گزشتہ پانچ سال سے باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے، قارئین اس بات کے گواہ ہیں کہ سپوٹک جنسی یا سننی خیزی اور وقت ضائع کرنے والے مواد کو اپنی اشاعت پر بھانے اور مقبولت میں اضافے کی غرض سے شائع کرنے سے ہمیشہ گریزان رہا ہے "سپوٹک" کے سلسلے میں اب تک 50 سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں پاکستان کی دوسری قومی زبانوں کے منتخب افسانوں کے ساتھ ساتھ غیر ملکی بہترن کمانیوں کے تراجم بھی پیش کئے جا چکے ہیں۔ جولائی ۹۹ء میں محترم پروز بخت قاضی کی کوششوں سے "دنیا کھاتہ" کے عنوان سے مغربی دنیا کی چند بہترن کمانیوں کا انتخاب پیش کیا گیا تھا جبکہ موجودہ شمارے میں محترم ڈاکٹر پروفیسر مرزا حامد بیگ نے یونانی، امریکی، ہندی، ہسپانوی، افریقی، اور فرانسیسی ادب سے اعلیٰ پائے کا افسانوی انتخاب پیش کیا ہے اس مجموعے کی دوسری بڑی اور اہم خوبی یہ ہے کہ اس کی ہر کمانی کے مصف کا ایک بھرپور تعارف بھی کمانی سے پہلے شامل کیا گیا ہے۔ اس تعارف پر بے پناہ محنت اور تحقیق سے کام لیا گیا ہے جس کا اندازہ آپ کو مطالعے کے دوران ہو جائے گا۔

"مولائے کائنات" حضرت علی علیہ السلام پر گزشتہ ماہ شائع ہونے والا شمارہ جس میں تین اہم، نادر اور نایاب کتابیں شائع کی گئیں تھیں اور جو ضخامت میں عام شمارہ سے برابر یعنی 248 صفحات پر مشتمل تھا، کی مقبولت اور پسندیدگی پر ہم قارئین کے مشکور ہیں۔ رسائل کا دوسرا ایڈیشن چھانپا ناگزیر ہو گیا تھا۔ انشاء اللہ بہت جلد سفید کاغذ پر جلد ایڈیشن بھی پوری آب و تاب کے ساتھ کلاسیک لاہور کی جانب سے پیش کر دیا جائے گا۔

آغا امیر حسین

نرناری

(یونانی، امریکی، ہندی، ہسپانوی، افریقی، جرمن اور فرانسیسی ادب سے انتخاب)

ہند رجھات

○ ابتدائیہ :	مرزا حامد بیگ	نرناری
○ تعارفیہ :	مرزا حامد بیگ	ایو سے ٹکول
○	ایو سے ٹکول	زندگی حسین ہے
○ تعارفیہ :	مرزا حامد بیگ	ارنسٹ ہمکنگوے
○	ارنسٹ ہمکنگوے	بارش میں بلی
○ تعارفیہ :	مرزا حامد بیگ	عالم شاہ خان
○	عالم شاہ خان	کرائے کی کوکھ
○ تعارفیہ :	مرزا حامد بیگ	خورخے لوئیس بور خیں
○	خورخے لوئیس بور خیں	جنم ۳۲۰-۱
○ تعارفیہ :	مرزا حامد بیگ	فراز کافکا
○	فراز کافکا	ڈوچی سوار
○ تعارفیہ :	مرزا حامد بیگ	ایماں زولا
○	ایماں زولا	تھریسا
○ تعارفیہ :	مرزا حامد بیگ	ہومر
○	ہومر	اوڈیسی

مرزا حامد بیگ

انتخاب و ترجمہ

ترجمے کافن



ایک یوہانی مقولہ ہے کہ ”ترجمہ یہ شے ایک بھجنی ہوئی سڑا یہی ہی رہے گا۔“ یعنی ترجمے کے دوران اصل چیز کے ذاتی میں فرق ضرور پڑے گا۔
پھر یہی سب ہے کہ ڈاکٹر سیموئل جانس شاعری کے ترجمے کو ناممکن قرار دیتے ہیں اور یہ اسی فریبز کو ترجمے کی زبان قابل الفاظ دکھائی نہیں دیتی۔ حد یہ ہے کہ مشہور مترجم ایڈورڈ ٹرنز جیمز الڈ زندہ کتبے کو مردہ شیر سے بستر قرار دیتے ہیں۔

ترجمے کے فن سے متعلق یہ آراء تو ۱۹ ویں صدی تک کی ہیں، جب کہ ۲۰ ویں صدی میں دو مکتبہ ہائے فکر سامنے آتے ہیں۔ پہلا گروہ مخالفین کا ہے: گرانٹ شاور مین کر پیلی کے خیال میں ”ترجمہ کرنا ایک گناہ ہے۔“ پوفیسرا ملبرٹ گیرارڈ کے نزدیک ”ترجمہ“ نام ہے ایک سُنْ نامنگھور کا، جس کے مطے میں شدید مشقت کے بعد صرف حقارت ملتی ہے۔

کی تفصیل وقت چاہتی ہے۔ لیکن یہی وہ زمانہ ہے جب علمی اور ادبی سطح پر ہمارے ہاں ایک داخلی سمجھ دکھائی دی۔ اس دور کے ادباء و شعراء کے ایک گروہ کے خیال میں پیروئی مغرب ہی زندہ رہنے کی واحد صورت تھی، اور دوسرا گروہ مغرب کے بیانے کا زیر بار احسان رہتے ہوئے ابن العلی اور ابن رشیق پر گزارا کرنا چاہتا تھا۔ جب کہ تیسرا گروہ مغرب سے بھی صاحب سلامت کا خواہاں تھا اور مشرق تو تھا ہی اپنا۔ سو ۱۹ ویں صدی عیسوی کے نصف آخر اور ۲۰ ویں صدی کے نصف اول میں ہم مشرق اور مغرب کے فکری ابعاد کے درمیان ڈگنگاتے پھرے۔

لیکن یہ دو طرفہ آگ تھی۔ ہمارا ادبی ترقی کی معرفت، مغرب کی سمت تجسس کے ساتھ دکھائی رہا تھا اور مغرب نے مشرقی لبادہ اوڑھنے کی کوشش کی تھی۔

مغرب میں اس میلان کے ابتدائی نقوش مارلو اور ٹیکپیز کے ڈراموں میں دکھائی دیتے ہیں۔ جب کہ ہمارے ہاں ۱۸۸۰ء کے قریب رڈیارڈ کپلنگ اپنے مشرقی حوالوں کے ساتھ ابھرا۔ یہ الگ قصہ ہے کہ بالآخر سطح پر اس نے انگریز راج کے ہی تصور کو تقویت ہیم پنچالی۔

کپلنگ سے پہلے میکنزی نے ۱۸۸۵ء میں سرمشروم اور کرفی میڈوز نیلز نے امیر علی ٹھک کی ذات کے حوالے سے ہندوستان کے باسیوں کا خوب خوب مختکہ اڑایا اور ہمارے رتن ناقہ سرشار نے اصل حقیقت سے ناواقفیت کی ہتا پر میکنزی کی کتاب "اعمال نامہ روس" کا ترجمہ کیا۔ سو کہا جا سکتا ہے کہ کپلنگ کی ذہنیت پیدا کرنے کو ۱۸۸۵ء سے زمین ہموار کی جا رہی تھی۔ آگے چل کر یقول محمود ہاشمی: "ایز راپاؤ نڈ" میکنا کارنا کے ساتھ ساتھ مشرقی لفظ اور مشرقی شاعری کے ترجم اور حوالوں کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اسی نے ایمیٹ اپنے "خوابے" اور "کار تھی" کے خوابوں کے بعد "اوم شانتی شانتی" کی منزل تک آتا ہے۔ اسی نے سارتر بدھ سے قریب دکھائی دیتا ہے۔ اسی نے بیشن نے مغربی ادبی بدھ بن گئے تھے۔ اسی نے ایمن گنسبرگ (ALLEN GINSBERG) امریکہ سے ہندوستان کا سفر کرتا ہے اور امریکہ میں رہتے ہوئے اپنی نظم میں اس خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ:

" AMERICA ,

جب کہ عملی سطح پر دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ ارنست فینلوس، ایزرا پاؤڈنڈ اور آر تھرویلی نے ترجمے ہی کے ذریعے قدیم مشرقی شاعری کو مشرق و مغرب کی حال کی شاعری میں بدل دیا، اور پاؤڈنڈ نے جب بجٹ کیر کے چند دو ہوں کے ترجمے کے بعد کیشوز لکھتے تو اس کی شاعری میں "کہت کیر" کی گونج نہیاں تھی۔ یوں ترجمہ، گلائیں کا ممکن ہے۔ اور یہ کام کچھ لوگ کر گز رے۔ جنہیں تک حرام اور غدار تک کما گیا۔ اس میں پہلا نام ۲۵۰ قبل مسیح کے یویوس اندریو نیکس (LIVIUS ANDRONICUS) کا ہی لیا جائے گا۔ جس نے اول ہومر کی "اوڈیسی" کو لاطینی زبان میں ترجمہ کیا اور تادیر گنائی سے بناہ کیا۔ انگریزی میں بابل کے اولین مترجم ولیم خڈیل کی ساری عمر جلا وطنی میں گزری، وہ ۱۹۳۵ء میں گرفتار ہوا، ۱۹۳۶ء میں چنانی پائی اور اس کی لاش کو آگ میں جھوٹک دیا گیا۔ خود ہمارے ہاں ترجمہ قرآن کے بعد نذیر احمد دہلوی سے عالمانہ مذہبی تقدس بھی چھن گیا۔

شاید اسی لئے ترجمے کی دیوالا نے مترجم کی حالتِ زار کو "سمی فس" سے خیسہ دی ہے، جو انتہائی باختیار ہونے کے باوجود ہے بس اور قابلِ رحم ہے۔ ہمارے ہاں ادبی ترجم کی تاریخ میں "راسل" از ڈاکٹر سیموں کل جانس کے ترجمہ "تواریخ راسل"، شنزادہ جہش کی "از سید محمد میر لکھنؤی" مطبوعہ: اگرہ طبع اول ۱۸۳۹ء کی اہمیت اس اعتبار سے ہے کہ بلا کسی تک و شبہ کے، مغرب کی کسی بھی زبان سے اردو میں ہونے والا کتابی صورت میں یہ پہلا ادبی ترجمہ ہے۔ اس سے قبل ڈاکٹر جان گلگوٹ نے اپنی کتاب "ہندوستانی زبان کے قواعد" مطبوعہ: کلکتہ: طبع اول ۱۸۴۱ء میں ولیم ٹیکسپیر کے دو ڈراموں "علٹ" اور "ہنری ہشم" کے دو چیزہ اقتباسات کا اردو ترجمہ پیش کیا تھا۔ واضح رہے کہ ہمارے اولین ادبی مترجم سید محمد میر لکھنؤی، روپورنڈ چارلس کی چھ جلدیں میں کیشری۔ متعلق کتاب کا ترجمہ ۱۸۲۸ء میں طبع کروائی گئے تھے اور یہی وہ زمانہ ہے جب میر امن دلی والے نے "باغ و بمار" اور "جنگر خونی" کے بعد روپورنڈ چارلس کی سات جلدیں پر مشتمل کتاب "تیسہ شمیہ" کا ترجمہ غلام علی الدین متنین حیدر آبادی، مژد جونس اور موسیو تندرس کے ساتھ مل کر مکمل کیا۔

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے پنجم تک صرف علمی ترجمہ سامنے آئے، جن

WHEN WILL SEND YOUR EGGS TO INDIA "

یہ تو تھی محل صورت حال، البتہ اردو میں مغربی زبانوں سے ادبی ترجم کا جائزہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ اردو زبان و ادب کی وسعت اور تینکیکی سلطتوں پر گمراہی و کیرائی میں اخذ و ترجیح کا خاصاً اہم کروار رہا ہے۔ مثلاً یہ کہ ترجم نے نئے اسالیبِ بیان کو جنم دیا، نئے طرزِ احساس کو ابھارا، پیرایہ بیان میں صلابت، ممتاز اور استدلال کو بڑھاوا دیا اور پیرایہ اظہار کے نئے نئے ساختے فراہم کئے۔ یوں اردو ادب میں تذکرہ کی جگہ تغییر، داستان اور تمثیل کی جگہ ناول، رہس اور نویں کی جگہ ذرا ما اور کتابی کی جگہ افسانہ جیسی جدید امناف نے لے لی، اور ادبیاتِ عالم کے ساتھ قدم بقدم چلنے کا خواب ہم نے پہلی بار دیکھا اور یہ سب اس وقت ہوا، جب ہم نے سو سے زائد آپ بیتیاں ڈیڑھ سو افسانوی مجموعے، درجنوں ادبی تاریخ سے متعلق کتب، دو سو پچاس ذرائے سے متعلق کتب، ساختہ سفر نامے، ایک سو اخبارہ سوانحی کتب اور ڈیڑھ ہزار ناول کتابی صورت میں نہ صرف ترجمہ کر لئے بلکہ یہ سب کچھ کتابی صورت میں شائع ہوا۔

قیصے، رزیئے، کمانیاں، روزنامے، مضامین، خطوط، تغییری کتب اور شعری مجموعوں کے ترجم اس کے علاوہ ہیں۔

نیز مستقبل میں ترجمہ شدہ غیر مدون مواد، طباعت کے وقت کی لائکھ صفحات گھیرے گا۔ ابتداء میں ادبی سلیمانی پر، ترجیح کی معرفت، بیویت، تحقیک اور موضوعی کوئیوں سے آشنائی نی تھی اور مغربی ادبیات کی روایت کا شعور تقریباً ناپید تھا۔ جس کے ترجیح میں ترجم ہوئے تو، لیکن انتہائی بے سلیمانی کا مظاہرہ بھی دیکھنے میں آیا۔ قاری کی دلچسپی کو مد نظر رکھتے ہوئے ترجیح کے نام پر کامنہ کباز کے ڈھیر لگا دیئے گئے۔

ایسے ترجم کا برا نفس یہ ہے کہ علاوہ غلط اور غیر محترم ہونے کے وہ مستند اور اہم کتب کے ترجیح نہیں تھے۔ مثلاً جارج ولیم۔ ایم ریمالڈز کے کتابی صورت میں چپن سے زائد ترجیح ہوئے اور مختلف مترجمین نے کئے، اور اس پر غضب یہ کہ ترجمہ در ترجمہ ہوئے اور مترجمین نے اصل متن دیکھنے کی رحمت گوارانہ کی۔ یہی صورت "آزاد ترجمہ" میں سامنے آئی اور ہمارے مترجمین نے "ڈان کیجوٹے" کو ترجمہ کرتے ہوئے ہسپانیہ کے بازاروں میں جن طوائی اور لکھنؤ کے باکنوں کو جدی پشتی وہیں کا ثابت کر دیا۔ کرداروں کے نام اور جھموں کے آثار تو

تبدیل ہوئے ہی، ان کی عادات و خصائص تک بدل گئے۔ ابتدائی مترجمین کی ترجمے کے فن سے ناواقفیت اور تن آسانی نے تراجم میں ایک نیا طرز تحریر بھی ایجاد کیا۔ جس کے لئے انگریزی میں JOURNALESE کی اصطلاح موجود ہے۔ یعنی ایک ایسی ناقص زبان کسی میں، جو نہ تو خیالات کے انہمار پر قادر تھی اور نہ ہی معنی کی تریل پر۔ یہ اس لئے بھی ہوا کہ مشرق میں ”لفظ“ ”خاصیت یا داخلی شیفت کا نمائندہ ہے۔

محمد حسین آزاد نے ”آب حیات“ میں لکھا تھا:

”----- ہاں یہ کام ہمارے نوجوانوں کا ہے، جو کشور علم میں مشرق اور مغرب، دونوں کے کناروں پر قابض ہو گئے ہیں۔ ان کی ہمت آبیاری کرے گی۔ دونوں کناروں سے پانی لائے گی۔“

اس رائے پر تبصرہ کرتے ہوئے مددی جعفر لکھتے ہیں:

”مطہر خاطر رہے کہ بات پانی لانے کی ہے، کناروں پر تبیرتے ہوئے الفاظ اکٹھا کرنے کی نہیں۔ تخلیق اور ترجمے میں بہر حال فرق ہے۔ خیر مغرب والوں نے تو اپنے پانی سے اپنے ہم مزاج الفاظ نکالے ہیں۔ ہم نے ترجمے کے ذریعے انسین الفاظ سے شعبدہ بازی یا چونکانے کا کام لیتے ہوئے بے اختیاری کا ثبوت دیا ہے۔“ (اردو افسانے کے افق)

مددی جعفر نے محولہ بالا مضمون میں مشرق اور مغرب کے مزاجوں کی سطح پر فرق کو ”کیمیا گری“ اور ”کیمیا دانی“ کا فرق قرار دیا ہے۔ اور ادب کو تراجم کی معرفت ”کیمیا گری“ سے ”کیمیا دانی“ کی طرف لانے کا کام یوں تو فورث ولیم کالج میں ہونا قرار پایا تھا لیکن اس باب میں بھی سر سید احمد خان بازی لے گئے۔ انہوں نے اردو ادب کو جس زندگی کا تحفہ دیا اس کی بنیادیں عقلیت، اجتماعیت، مارت و حرائق نگاری پر تھیں۔

سر سید احمد خان کی معرفت مشرق کے لئے مغرب کی اس عطا کی کھوج میں نکلیں تو پہاڑا ہے کہ ”لفظ“ کی سطح پر ہم ”واظیت“ سے اسی زمانے میں دست کش ہونا شروع ہو گئے تھے جب سے یورپی اقوام نے ہمارے ساحلوں پر اول اول قدم رکھا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ”ئے“ اور ”جدید“ ادب تک آتے آتے نہ ہماری زمینی بُباس اپنا پا رہتی ہے اور نہ ہی ہمارے ہاں کے

محاشری، سیاسی اور اقتصادی حوالوں کا نشان ملتا ہے۔ اردو میں مغربی تراجم کے زیر اثر ہمارے افسانوی ادب کو مخصوص نوع کی مغربی روشن کا سامنا رہا جس کے باعث ہمارے افسانوی ادب کا پیشہ حصہ ایسا ہے کہ اسے بڑی آسمانی سے "اینگلو ایڈیشن ادب" کے کھاتے میں ڈالا جا سکتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارے ادباء کو اوائل ۲۰ ویں صدی کی قوی تحریکوں کا ہمنوا بن کر ہی ترجمے کی طرف آنا چاہئے تھا بلکہ مقصد یہ ہے کہ ہمیں زرق برق مغربی تندیب اور انگریزی ادبیات کا مطالعہ مخصوص محاشری اور سیاسی حوالوں، ذہنی رویوں، ضرورتوں اور انگریزی زبان نیز مغربی ادبیات کے پس مظفر میں رکھ کر کتنا چاہئے تھا، اور یہ بھی کہ اردو زبان کے نئے عمدے سطحیات رکھنے والی لسانی تکمیل اور اسلوبیاتی دائرہ عمل کے بارے میں منصوبہ بندی کی ضرورت تھی۔

محمد حسن عسکری نے مذکورہ بالا عوامل کا تجویز کرتے ہوئے اردو ترجمے کی روایت کو کھنگال ڈالا اور اس کا رد عمل خود ان کے تراجم ہیں۔

اردو میں ترجمہ نگاری کے مروجہ چلن پر عسکری صاحب نے سب سے بڑا اعتراض یہ کیا ہے کہ مجموعی طور پر ترجموں کے ذریعے ہمارے تخلیقی ادب کو زیادہ فائدہ نہیں پہنچا۔ جس کی سب سے بڑی وجہ یہ رہی کہ ہمارے مترجمین، ترجمے کی اہمیت سے ناقصیت کی بنا پر اسے تخلیقی مسئلہ نہیں سمجھتے۔ ترجمے کا جواز بھی موضوع یا کمائی کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا نہیں۔ اصل بات تو ترجمے کے ذریعے ترقی یافتہ زبانوں کے اسالیب کو اپنی زبان میں ڈھالنے اور راجح کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ خواہ رتن ناٹھ سرشار کا سروانتس سے ترجمہ "خداوی فوجدار" ہو یا قسمی رام پوری کا ریالائز سے ترجمہ "فناہ لندن" ہمارے ہاں آزاد ترجمے کی روایت نے بڑے بڑے ٹھنڈے ٹھنڈے ہیں اور ترجمے کے مذاق کو خراب کرنے میں ان ہی آزاد ترجموں کا ہاتھ رہا ہے۔ پھر اردو نثر اور بالخصوص افسانے پر آسکرو انکلڈ اور دیگر مغربی جمال پرست ادباء کے غالب اثر کی نہادت کی جاتی ہے اور اسے اردو نثر کی اسلوبیاتی روایت کے لئے تعصان دہ قرار دیا جاتا ہے۔ یہ بات مکمل طور پر قبول نہیں کی جا سکتی۔ جمال تک تراجم کے زیر اثر زبان کو بڑھاؤ دینے کا معاملہ ہے تو اس میں مولانا حامد علی خاں، لطیف الدین احمد، جلیل قدوالی، مجتوں گور کپوری اور خواجہ محفور حسین چیسے جمال پرست انجلوں کی عطا سے انکار کیسے ممکن ہے؟

مجموعی طور پر دیکھیں تو پہم چند کے فوراً بعد سز عبدالقادر اور جاپ امتیاز علی کے افسانوں میں ایئے گرامین پو کے زیر اثر تحریر اور اسرار کی جو انوکھی فضا بندی دیکھنے میں آتی ہے وہ تیکنیک اور موضوعی حوالوں کے ساتھ اسلوبیاتی سلسلہ پر بھی خاصے کی چیز ہے۔ جب کہ مجنوں کے افسانے جہاں اسلوبیاتی سلسلہ پر غیر محسن کی زبان کو اردو نگہش میں پہلی بار تعارف کروانے کے سلسلے میں یادگار ہیں، وہیں پر ان کی گمراہی سمجھیگی اور محاسن کے بیان پر قدرت، انگریزی اور دیگر مغربی ادبیات سے گھرے شفت پر وال ہے۔ خیریہ تو ہوسیں اثر و قبول کی دو ایک مثالیں۔

لیکن جہاں تک اسلوبیاتی سلسلہ پر ردو قبول کا معاملہ ہے تو ہمارے ہاں کے متربجين نے پہشہ روانی اور سلامت، کی ہی تناکی ہے۔ اور ہمارے اکثر نادین نے اسی روانی اور سلامت کو ترجمے کی خوبی گزوریا ہے۔ حالانکہ برا مترجم وہ ہے جو متمول زبانوں سے ترجمہ کرتے وقت یہ کوشش کرتا ہے کہ اس کی اپنی مغلس زبان کے رہے ہوئے کھانچے بھر جائیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے محمد حسن عسکری نے فلاہیہ اور محمد سعید الرحمٰن نے ہومر کو ترجمہ کرتے وقت ٹھنڈک اور طویل جملوں کو اردو جیسی قدرے نئی زبان میں منتقل کرنے کا جتن کیا ہے۔

حران کن بات یہ ہے کہ ہمارے پیشتر مترجمین نے روانی اور سلامت کی دوڑ میں یہ نہیں سوچا کہ اردو نشر کا برا مسئلہ تو طویل اور چیزیدہ جملہ لکھنے کا ہے اور اگر کسی ترقی یا فتح زبان کے فن پارے میں تخلیق کارنے چیزیدہ تراہسات و جذبات کو لفظوں میں منتقل کرتے وقت یہ کارنامہ انجام دوا ہے تو کوشش کر کے اسے ان ہی قواعد و ضوابط کے ساتھ اردو میں کیوں نہ منتقل کر لیا، اس سے ہماری زبان میں بھی اسلوبیاتی سلسلہ کوئی نقی راہ سونجھنے کا امکان پیدا ہوتا۔ یہ اس کے باوجود ہے کہ اردو نشر میں ٹھنڈک تحریات اور چیزیدہ جذبات و تحریات کو سارے کی قوت نہ ہونے کے برابر ہے۔ ”اور“، ”اگر“، ”لیکن“ وغیرہ لگا کر جملوں کو جوڑتے چلے جانے سے برا جملہ نہیں بنتا۔ سو کہا جا سکتا ہے کہ ہماری زبان اور ادبیات نے ترجمے کے ایک عظیم حکم سے بہو آزمار بننے کے باوجود خاطر خواہ حد تک فائدہ نہیں اٹھایا۔

اب آئیے سرسری طور پر یہ بھی دیکھنے چلیں کہ ہماری مختلف اصنافِ ادب نے ترجمہ کے زیر اثر کیا کچھ متفقی اور مثبت اثرات قبول کئے۔

نادلوں کے سلکلوں ترجم ہو چکے کے باوجود شروع شروع میں ہمارے ہاں داستان، تمثیل اور ناول میں فرق مٹا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ایک دست تک نذرِ احمد دہلوی کے تمثیلی قصوں کو ناول

قرار دیتے رہے اور نذری احمد دہلوی کے سراویں ناول نگار ہونے کا سرا باندھتے رہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب مغربی ناول نگاروں خصوصاً وکٹر ہیو گو، الگزیںڈرڈوہا، زولا، بالڑاک، اناطول فرانس اور اسکات وغیرہ کے تجھ میں نذری احمد دہلوی کے ساتھ رتن ناچھ سرشار، عبدالحیم شر، شاد عظیم آبادی، سجاد عظیم آبادی، راشد الخیری، اور مرزا ہادی روسا اردو میں ناول نگاری کے چلن کو عام کرنے میں مصروف تھے۔

نذری احمد دہلوی کی تخلیقیں اشی و نن کے "نیزیر آئی لینڈ" کی طرح ہر قسم کی بد اخلاقی حقیقت کہ حسن و عشق سے بھی خالی ہیں۔ نذری احمد پر دوسرا بڑا اثر جارج ایلیٹ کے ناولوں کا تھا خصوصاً کردار کی پیش کش میں نفسیاتی تجویز نگاری، جو جارج ایلیٹ ہی سے مخصوص ہے۔ جب کہ "بہات النحل" نام کے کاچہ ہے۔ رتن ناچھ سرشار کا "فسانہ آزاد" اور "خدا کی نوجہ دار" ہر دو تحریریں سروائیس کے "ڈان کیمپتے ڈی لامانشا" سے جنم لئی ہیں اور کچھ یہی معاملہ سجاد حسین کے " حاجی بغلول" کا ہے۔

ہمارے باقاعدہ اولین ناول نگار عبد الحیم شر کی تاریخی ناولوں کی تمام تر عمارت سروالر اسکات اور رچڈ سن کی نیادوں پر کھڑی ہے جب کہ انہوں نے ایک باقاعدہ ترجمہ ریتالڈز کے ناول کا "خوبی قست" کے نام سے بھی کیا۔ اسلوبیاتی سلیخ پر شر نے بے قافیہ شاعری کرتے ہوئے مصریوں کو ایک آزاد تسلیل میں مربوط رکھنے کا جتن کیا ہے جو سراسر اسکات سے مخصوص ہے۔ سروالر اسکات کی مقبولت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ اسلوبیاتی سلیخ پر اسکات کے اثرات شر سے حکیم محمد علی خان تک پہنچے، جنہوں نے ناول کو، "ادبِ لطیف" بنانے کی کوشش کی۔

مرزا ہادی روسا نے ماری کوریلی کے پانچ جاسوی ناولوں کو "خونی بھید" "خونی جورو" "خونی مصور" "خونی عاشق" اور "بہرام کی رہائی" کے نام سے ۱۹۲۸ء تک ترجمہ کر کے طبع بھی کروادیا تھا، یہ الگ قصہ ہے کہ انہوں نے اپنی طبع زاد نگاشن میں جاسوی عنصر کو شامل نہیں ہونے دیا۔ البتہ جاسوی ادب سے اثر پذیری، ظفر عمر کے ہاں باقاعدہ سراغ رسانی کے ادب میں ڈھل گئی اور تیرنگہ رام فیروز پوری کے طبع زاد ناول اس سے اگلا قدم ہیں۔ جب کہ بطور مترجم تیرنگہ رام فیروز پوری نے ایک سو دس ناولوں کے ترجم مطبوعہ کتابی صورت میں یاد گار چھوڑے۔ مغرب کے معروف ناول نگاروں میں آر۔ ایل اسٹیو سن (مترجم = مولانا عبد الجبار

سالک) ارنست نیکنگوئے (مترجم = اشفلق احمد - ابن سلیم - بشیر ساجد)
 اروگنگ سٹون (مترجم = سید قاسم محمود) سینیفن کرین (مترجم = انتشار حسین) اشروع
 ایڈرنس (مترجم = محمد حسن عسکری) آگنات ہرمن (مترجم = حمید اختر) البرتو مورادیا (مترجم = ایں -
 اختر جعفری) الیبر کامیو (مترجم = بشیر چشتی) ڈاکٹر افضل افضل - محمد عمر میمن - انیس ناگی) الفڑو
 نیوین (مترجم = خواجہ عبدالکریم) الگنڈنڈر ڈوما (مترجم = تحریخ رام فیروز پوری) اناطول فرانس
 (مترجم = مولوی عنایت اللہ دہلوی - عبد الرزاق طیح آبادی) او - ہنری (مترجم = ابن انشاء - سلیم
 صدیقی) ایڈرالین پو (مترجم = ابن انشاء) ایڈرگر رائکس (مترجم = ایم - بے عالم) ایریچ یکل
 (مترجم = ستار طاہر) ایرک میرزا ریمارک (مترجم = احسن طاہر) ایفے دائل گرین (مترجم = ابو سعید
 قربی) الیزخہ کوٹس ور تھے (مترجم = مولانا عبد الجبار سالک) ایمانل زولا (مترجم = سید حسن رضوی)
 ایوان شین (مترجم = نذر صدیقی) باڑاک (مترجم = سیدہ حسینہ ہدایتی - یوسف عباسی) پل - ایں -
 بک (مترجم = اختر حسین رائے پوری - ابو سعید قربی) - قرنوقی - احسان علی - یوسف ظفر
 ٹامس ہارڈی (مترجم = مجنوں گور کپوری - رئیس احمد جعفری - شنیش بابو مشماج) جارج ایلیٹ
 (مترجم = محمد سعید) جارج ولیم ایم ریالڈز (مترجم = تحریخ رام فیروز پوری) 'مولانا ظفر علی خاں'
 عبد الحلیم شرر، امیر حسن کاکوروی، کندن لال شرر، صدیق احمد، اڑ لکھنوتی، نوبت رائے نظر، بابو
 پر شاد، شیم بلوری، لالہ رنا تھے) جان شین بک (مترجم = ابن انشاء، متاز شیرس، زہرہ
 سیدین، مظہر انصاری) جان ماشرز (مترجم = سید قاسم محمود) جوہان ہنرخ پیتا لوزی (مترجم = غلام
 حسین) پی - بے دہاؤس (مترجم = ستار طاہر) جیک شیفر (مترجم = شان الحق حقی، غلام حسین)
 چارلس ڈکنز (مترجم = خان احمد حسین خاں، فضل الرحمن) ڈی - ایچ لارنس (مترجم = سیدہ حسین
 ہدایتی) روڈیارڈ کپلنگ (مترجم = مولانا ظفر علی خاں، مولوی عنایت اللہ دہلوی) ساؤ میگ (مترجم
 = محمد خلیق) ستار دال (مترجم = محمد حسن عسکری) سرست ماہم (مترجم ڈاکٹر سید محمد عقیل) ٹنکیٹ
 لوئیس (مترجم = عابد علی عابد) سروانتیس (مترجم = رتن ناتھ سرشار، سجاد حسین) شارٹ برائے
 (مترجم = سیف الدین حام) فرانوا ساگان (مترجم = ستار طاہر) گستاو فلاہیز (مترجم = محمد حسن
 عسکری، مولوی عنایت اللہ دہلوی) نیکلن سائنس (مترجم = ظہور الحسن ڈار) کرشنوف اشروع (مترجم =
 محمد حسن عسکری) کلینٹن ڈے (مترجم = جاوید شاہین) کیتھ رابرٹس (مترجم = سید قاسم محمود)
 گوڈ فرے یوس (مترجم = شاہد احمد دہلوی) گوئئے (مترجم = میاں محمد افضل) لویز اکٹ (مترجم =

حجاب امتیاز علی تاج، اشرف صبوحی) لوئیس بروم فیلڈ (مترجم = مولوی عنایت اللہ دہلوی۔) لوئیس
سکپٹر (مترجم = عابد علی عابد) مس کون کوٹھٹ (مترجم = صادق الحیری) موپاسان (مترجم = سید قاسم
محمود، فضیر حیدر، فوح فاروقی، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، طاہر قریشی) میڈوز ٹیلر (مترجم = محمد رئیس
الزمان خاں رئیس) نیشنل ہاتھورن (مترجم = سیدہ حسینہ ہماری) نٹ نیشن (مترجم = عشرت
رحمانی) سروالزا سکات (مترجم = عبدالجلیم شرر) وکٹر ہیوگو (مترجم = سعادت حسن منو، رام سروپ
شرا، بشارت انور) والٹر (مترجم = سجاد ظہیر، بشیر ساجد) ولیم سرویاں (ن۔ م راشد، شفیق
الرحمی، سید رضی ترمذی) ہال کین (مترجم = ایم۔ ایلم) ہاورڈ فاٹ (مترجم = الیس اعظمی،
احسن علی خاں) ہرمن ملکول (مترجم = محمد حسن عسکری۔) ہنری بہن (مترجم = قرۃ العین حیدر)
رائیدر بیکر (مترجم = سلطی تصدق، مولانا ظفر علی خاں، مظہر الحق علوی، آغا اقبال، بشیر احمد اختر،
مشی خلیل الرحمن، عاصم محاربی، ٹریا اقبال، مولوی عنایت اللہ دہلوی) ہیرلند لیم (مترجم = عزیز احمد،
گزار احمد، یوسف عبایی، جیل نقوی، آخر عنز آخر، غلام رسول مر، وزیر الحسن عابدی،
سید ہاشمی فرید آبادی، محمد ہادی حسین)

یہ چند ایسے نام ہیں جن کے اردو میں ترجمے سے ہمارے ہاں نہ صرف یہ کہ ناول کا چلن عام ہوا
بلکہ ناول کے عناصر ترکیبی کو بھی سمجھنے میں مدد ملی۔

اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کوشش میں معروف شاعر یوسف ظفر کا بھی حصہ ہے۔
جن کا ترجمہ، "ای میں تمہاری ہوں۔" (ازپل الیں بک) کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع
ہوا اور اس کتاب پر ناشر نے ن۔ م راشد کا نام شائع کرنا مناسب خیال کیا۔ واضح رہے کہ یہ
ترجمہ یوسف ظفر کا ہے نہ کہ ن۔ م راشد کا۔

پارسی اسلیج کے فروع کے ساتھ ہی انگریزی سے اسلیج ڈراموں کو اردو میں منتقل کرنے کا کام
شروع ہوا اور ولیم یونکپٹر کی عالمگیر ثہرت سے باس آفس پر کامیابی کا تصور بنتا ہا لیکن افسوس
کہ یونکپٹر کے پیشتر ترجمہ ناقص ہیں۔ ان میں پلات کی تبدیلیاں کی گئیں۔ مقامی رنگ میں اس
قدر رنگ دیا گیا کہ پہچان مشکل ہو گئی یہاں تک کہ تجارتی ضروریات کو لحوظ خاطر رکھتے ہوئے
بڑے پیمانے پر کافی چھانٹ بھی کی گئی اور اس فعلِ قیج میں ڈرامے کا اولین ولی مترجم احسان
اللہ بھی شامل تھا، جس نے یونکپٹر کے (او تھیلو) کا ترجمہ ۱۸۹۰ء میں شائع کروایا اور آغا حشر بھی
حشر کا کیا ہوا "KINGLEAR" کا ترجمہ "سخید خون" اس کی ایک نمایاں مثال ہے۔

سو، ڈراما کے باب میں ہمارا پلا قدم ہی غلط پڑا۔ کہا جا سکتا ہے کہ بس اُس پر کامیابی سوائے "جو لیٹھ بیور" کے "دو ترجموں از عزیز احمد اور سید فیضی"، "رومیو جو لیٹھ" کے دو ترجموں از عزیز احمد اور مولوی علیت اللہ دہلوی، "او تھیلو" کے ایک ترجمے از عزیز حامد منی اور "انطونی و قلبطرہ" کے ایک ترجمے از شان الحق حق کے کسی ترجمے کی داد قبیل دی جاسکتی۔ جب کہ شیخ یحییٰ کے ہمارے ہاں دو سو سے زائد ترجمے ہوئے اور مارس میر لنک کے ترجموں کی بھی کم دویں بھی صورت ہے۔ دیگر ڈراما نگاروں کے ترجموں میں "فاؤسٹ" از گوئے (مترجم = ذاکر عابد حسین) "بگزے دل" از مولیٹر (مترجم = محمد عمر و نور الہی) "صلی" از آسکروائلڈ (مترجم = انصار ناصری) "ظاہر و باطن" از شیرین (مترجم = فضل الرحمن)، چند ایسے ترجمے ہیں جن کے طفیل آگے چل کر اردو ڈرامے کو رفع چیز، خواجہ معین، اشراق احمد اور بانو قدسیہ جیسے ڈراما نگار مل گئے۔

دیگر معروف ڈراما نگاروں میں آسکروائلڈ (مترجم = مجتوں گور کچپوری، حکیم کاظمی، شاہد احمد دہلوی، سعادت حسن منتو و حسن عباس) آندریف (مترجم = ابو سعید قریشی) تھارٹن وائلڈر (مترجم = انتظار حسین، عشرت رحمانی) نالٹائی (مترجم = مجتوں گور کچپوری) جارج برناڑڈشا (مترجم = محمدوم محی الدین و مولوی میر حسن، مجتوں گور کچپوری، محمد اکبر دفاتانی، خورشید نعمت) جان گالزوری (مترجم = سید قاسم محمود، منتی جگت موہن لال روائی، دیا زائن نغم) ہے۔ بی پرٹلے (مترجم = اظہار کاظمی، محمد خلیق) آر چڈ (مترجم = محمدوم محی الدین) دوستوفیکی (مترجم = کمال احمد رضوی) رچڈ ہٹن (مترجم = بذر جہاں آراء) سرسٹ ماہام (مترجم = محمد اکبر دفاتانی) سوتوف (مترجم = عبداللہ ملک) سو فوکیز (مترجم = شاہدہ حمید خاں) شلر (مترجم = محمد عمر و نور الہی) گوئے (مترجم = شاہد احمد دہلوی، منتی جوالا پرشاد بریق، عبدالقیوم خان باقی، منور لکھنؤی، عزیز احمد) یسنگ (مترجم = منتی جگت موہن لال روائی، منتی محمد فیض الرحمن) مارس میر لنک (مترجم = نور الہی و محمد عمر، مجتوں گور کچپوری، دجھی محمد محمود آبادی، شاہد احمد دہلوی) ماس ہارت و جارج ایس کافین (مترجم = سید رضی تندی، کمال احمد رضوی) مولیٹر (مترجم = وہاچ الدین، محمد عمر و نور الہی) میری چیز (مترجم = کمال احمد رضوی) ہنرک ایس (مترجم = عبداللکھور، فضل الرحمن، عزیز احمد، محمد صدر) ہنری رائیزڈر یکڑ (مترجم = آغا اقبال) کے تراجم قابل ذکر ہیں۔

افسانے کی صفحہ میں تین نام بہت ترجمہ ہوئے یعنی چیزوں، موباساں اور رابندر ناتھ

نیگور کو انگریزی کی معرفت اردو میں متعارف کرنے میں پریم چند پیش پیش تھے اور یہ سلسلہ منتوںکے چلا آیا۔ منتو نے چیخوف اور موباسان کو نہ صرف ترجمہ کیا بلکہ ان کے طرز تحریر کو عام کرنے میں حصہ لیا۔ اسی طرح مطالبائی اور گورکی بھی منتو کی معرفت اردو میں متعارف ہوئے۔

چیخوف، موباسان اور مارس میترنک کے ترجموں کی عطا، راجندر سنگھ بیدی، منتو اور غلام عباس ہیں۔ ایڈ گرالین پو اور او۔ ہنری کو بھی ہمارے ہاں خصوصی توجہ دی گئی۔ یہی سبب ہے کہ ایڈ گرالین پو کے ابتدائی تراجم کے فوراً بعد اسی طریقہ کار کی محلہ مزرعہ عبد القادر اور جاپ امتیاز علی کے ہاں دیکھنے کو ملی۔

سرست ماہام جیسے دوسرے درجے کے افسانہ نگار کو ہمارے ہاں سادہ زبان اور سل انداز نگارش کے باعث مقبولت حاصل ہوئی۔ ماہام سے اڑ پذیری کی سب سے بڑی مثال کرشن چندر کے افسانے ہیں۔ روی افسانہ نگاروں کا واضح اثر پروفیسر محمد مجیب کے اولین افسانوی مجموعے "کیا اگر اور دوسرے افسانے" (مطبوعہ ۱۹۳۲ء) میں دیکھنے کو ملا، لطیف الدین احمد اور جیلی قدوالی، ترجمہ اور طبع زاد افسانے کی لمبی جملی صورتیں سامنے لاتے رہے۔

آخر حسین رائے پوری کا افسانوی مجموعہ "محبت اور نفرت" واضح طور پر روی افسانوں کے اثر کے تحت لکھا گیا اور افسانوں کی انتقالوی "انگارے" مرتبہ: احمد علی میں جنجز جواہس، ڈی ایچ۔ لارنس اور گستاؤ فلاہیز کے اثرات بہت نمایاں ہیں۔ آخر شیرانی نے شرت تو رومانی شاعر کے طور پر سمیئی لیکن ان کا سب سے اہم کام انتقالوی "دھڑکتے دل" میں شامل آسکر وائلڈ، موباسان اور گائز وردی کے افسانوی تراجم ہیں۔ معروف افسانہ نگاروں میں استینف کرین (مترجم= جاوید صدیقی) ایڈ گرالین پو (مترجم= ابن انشاء) ایڈرنس (مترجم= ریاض جاوید) سروا نیس (مترجم= رحیم) پرل ایں بک (مترجم= قرنوقی، یوسف ظفر) نامس ہارڈی (مترجم= جنون گور کچپوری) جیک لندن (مترجم= انور عنایت اللہ) رابندر ناتھ نیگور (مترجم= منصور احمد، حافظ اللہ افسر، پر تھوی راج نشر) استینف کرین (مترجم= جاوید صدیقی) موباسان (مترجم= نصیر حیدر) موریس لیول (مترجم= امتیاز علی تاج) واٹکشن اروگنک (مترجم= نیاز فتح پوری، غلام عباس، نسید وقار عظیم) کے کتابی صورت میں مطبوعہ تراجم نمایاں ہیں۔

سفر نامہ کی صفت ہمارے ہاں نہیں اور نہ ہی ہمارے ہاں مغربی سفر ناموں کے تراجم

خاطر خواہ حد تک ہوئے لیکن ہمارے سفر نامہ لکھنے والوں پر مخفی سفر نامے کے اثرات نمایاں ہیں۔ شاید اس کی ایک وجہ جدید سفر ناموں کی مخفی فضائی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آج کا اردو سفر نامہ اپنی قدیم روایت کے مقابلے میں سفر نامہ کم اور ویو کارڈ زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ کما جا سکتا ہے کہ مخفی سفر ناموں کی طرح کا تندبی مزاج ہمارے سفر ناموں میں تماطل پیدا نہیں ہو سکا، اتنا بھی نہیں جتنا چاہر اور مار جری کیپ کی تحریروں میں تھا۔ حالانکہ وہ اس سلسلہ کے ابتدائی نام ہیں۔ ہمارے ہاں زیادہ سے زیادہ مستنصر حسین تارڑ کی طرح ”ڈان جو آن“ بننے کی کوشش میں کتاب کو پست سلیمانی کی ٹکر کی گئی۔

اردو میں ترجمہ ہونے والے سفر نامہ نگاروں میں جزل گارڈن، ڈاکڑوی، میکنزی، ہنری ایم اشٹن، کالیر، ہے۔ بی ٹونٹر، لیڈی ڈافن (ترجم = محمد مظہر) رسل اروون (ترجم = مرتفعی احمد خان میکش) پروفیسر دیبری، مسز میکس ملر (ترجم = سید رشید الدین) سر آرول آشن (ترجم = سید محمد عظم فہی) آر۔ ایف برٹن (ترجم = محمد انشاء اللہ) ایڈمنڈ اسٹون سن، لیڈی ایولن کیولڈ زینب (ترجم = محسن شبیر) پرنیں البرٹ (ترجم = محسن شبیر) پرنیں البرٹ (ترجم = مشہر ناتھ) موسیو تھیونو، جان بین (ترجم = فی۔ ہیری دیونیں سٹک) جان لوئی برکھارت، میجر جزل جان میکم (ترجم = محبوب عالم) جوز ورن اور میجر ویلم گفرڈ و فیرہم کے نام کتابی تراجم میں نمایاں ہیں۔

○

اردو میں منظوم تراجم کی روایت بھی اتنی ہی مضبوط ہے، جتنی مشور ترجمے کی، ”البتہ کتابی صورت میں بہت کم سمجھا ہو پائی۔ اس خصوصی میں الاف حسین حالی کو اولیت حاصل ہے۔ ”ڈوان حالی“ میں ”اگریزی اشعار کا ترجمہ“ کے عنوان سے ایک نظم کا ترجمہ ملتا ہے، البتہ شاعر کا نام درج نہیں۔ بھاری لال ”فتح اگریزی“ نظموں کے منظوم تراجم“ ۱۸۷۶ء میں منظر عام پر آئے۔ ۱۸۷۸ء میں حالی نے ”زمزم قصری“ کے عنوان سے ایک معاصر برطانوی شاعر اسٹوک کی طویل نظم (جو دوبار قصری منعقدہ ۱۸۷۸ء میں پڑھی گئی) کا ترجمہ کیا۔ اسی طرح آئیور گولڈ سختہ کی نظم ”وزرینہ ولچ“ کا مشور ترجمہ بھی حالی سے یادگار ہے۔

اکبر اللہ آبادی نے رابرٹ ساؤدے اور ثینی سن کو پہلی بار اردو دنیا سے متعارف کر دیا۔ ثینی سن کی نظم ”برک“ کا ترجمہ بیشہ یاد رہے گا، لیکن منظوم تراجم کے باب میں جو شہرت گرے کی ”گور غیبان“ کے حوالے سے نظم طباطبائی نے پائی، اس کا توڑ آج بھی ممکن

نہیں۔ طباطبائی نے یہ ترجمہ عبدالحکیم شریر کی فرمائش پر کیا، جو پہلی بار جولائی ۱۸۹۷ء کے "وکلداز" میں شرر کے تعارفی نوٹ کے ساتھ شائع ہوا۔

اس ترجمے کی بے پناہ مقبولیت کے پیش نظر نظم طباطبائی نے کئی ایک ترجمے اور کئے۔ جن میں "زمرد فصل بہار" (گرے) اور "دولت خداداد افغانستان" (سر الفڑہ لاکل) نے شرت پائی۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں منظوم ترجمہ کی تحریک عبدالحکیم شریر کی تھی۔ طباطبائی کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے ضامن کشوری نے منظوم ترجمہ کا مجموعہ "ارمنان فرنگ" ۱۹۰۱ء میں شائع کروایا، جس میں ارل آف آسپورڈ، مسراز تھہ، ہیرٹ، براؤنگ، ولیم کوپر، ورڈوزور تھے، کورج، اگزینڈر پوپ، آئیور گولڈ سخت، جارج لٹن، تینیز موٹگری، نامس ہڈ، لانگ فیلو، شیلے، اسکاٹ اور ولیم ٹیکسپیڑ جیسے شعراء کے ساتھ پہلی بار ایک جو میں شاعر کی نظم کا ترجمہ "صلائے عام" کے عنوان سے شامل کتاب ہے۔ یاد رہے کہ ضامن کشوری کا ایک اور کارنامہ نامس مُور کی مشتوی "لالہ رخ" کا منظوم ترجمہ ہے۔ بعد میں "لالہ رخ" کا ایک نئی ترجمہ ل۔ احمد اکبر آبادی نے کیا۔

یوں شرر کے رسالہ "وکلداز" کی تحریک نے زور پکڑا، اور جب اپریل ۱۹۰۱ء میں "مخزن" کا پہلا شمارہ شائع ہوا تو اس کے اغراض و مقاصد میں سے ایک یہ بھی تھا: "انگریزی نظموں کے نمونے پر بمعہ اونظمیں، انگریزی نظموں کے بامحابوہ ترجمے شائع کرنا تاکہ حقہ میں کی تحلید کرنے والے چدید مذاق سے آگاہ ہوں۔" سو "مخزن" کے پہلے ہی شمارے میں، علامہ اقبال کی نظم "ہمالہ" سے متعلق سر عبد القادر نے لکھا کہ شاعر نے ملک الشعراء انگلستان، ورڈوزور تھے کے رنگ میں کوہ ہمالہ سے مکالہ کیا ہے۔ یاد رہے کہ اسی شمارے میں مولانا ظفر علی خاں نے نئی سن کی نظم "ندی کاراگ" کا ترجمہ پیش کیا تھا۔ مولانا نے بعد میں ورڈوزور تھے کی ایک نظم "وفا" کو بھی اردو میں منتقل کیا۔

علامہ اقبال نے متعدد ترجمے کئے، جن میں ایمرسن کی "پہاڑ اور گلری"، نئی سن کی "عشق اور موت" اور "رخصت اے بزم جہاں" لانگ فیلو کی "پیامِ صبح"، ولیم کوپر کی "ہمدردی"، "پرندے کی فریاد" اور "ماں کی تصوری دیکھ کر" نمایاں ہیں۔ اسی طرح اقبال نے فرانسیسی شاعر گاتیر کی نظم "آفتاب" کا بھی ترجمہ کیا۔

سرسری طور پر دیکھیں تو حقیقیں سے "اندھی پھول والی کا گیت" "از لارڈ لٹن اور بہار کا آخری پھول" "از نامس مور (متجم = محمد حسین آزاد)"، "ترانہ محبت" اور "موسم بہار کا آخری پھول" "از نامس مور (متجم = حضرت موبائلی)"، "می کا جوان چاند" "از نامس مور (متجم = عزیز لکھنؤی)"، "ترست جاناں" ، "معصید الفت" "عالمر جیری اور یادِ ایام" "انجامِ محبت" "جان شیرس" از معاصر برطانوی شعراء (متجم = غلام بھیک نیرنگ)، "مرحومہ کی یاد میں" ، "گزرے زمانے کی یاد" "از نامس مور (متجم = نادر کاگروی)"، "کوکل" "از ورڈ زور تھے (متجم = عظمت اللہ خان)"، "می سے خطاب" از ہوریں اعتماد (متجم = محی الدین قادری زور)، "نغمات" از یونکھیز، "کوکل" از ورڈ زور تھے "یونان کے جزیرے" از لارڈ بائز، "انب" از ہارڈی (متجم = ٹکوک چند محروم) "شیب و شباب" از رابرٹ براؤنگ (متجم = وقارِ احمد)، "آسمانی صیاد" "نوخ" از فرانس تھامس (متجم = ہادی حسین)، "مجھے دے دے رسلے ہونٹ" از رابرٹ براؤنگ (متجم = فیضِ احمد فیض) اور "سکائی لارک" از شیلے (متجم = فاخر ہریانوی) یادگار ترجمے ہیں۔

منظوم تراجم کی پہلی انتحالوی "فتحب انگریزی نظموں کے منظوم تراجم" مرتبہ = بماری لال (۱۸۶۹ء) اور ضامن کستوری کی "ارمخان فرنگ" (۱۹۰۱ء) کے بعد باقاعدہ انتحالوں میں نادر کاگردی کی کتاب "جد باستر نادر" (مطبوعہ = ۱۹۱۰ء) غلام محی الدین کی "دو آش" (۱۹۲۲ء) فاخر ہریانوی کی انتحالوی مطبوعہ، عطر چند کپور اینڈ بزر، میر حسن (حیدر آبادی) کی "ورڈ زور تھے اور اس کی شاعری" (۱۹۳۲ء)، "قریب دیرال" از اولیور گولڈ سمتو (متجم = سید راحت حسین)، "شعراء فرنگ" (متجم = ڈاکٹر عبد الوحید خان) اور "رنگ بست" (متجم = جعفر علی خاں اڑ) ۱۹۳۲ء کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

خبر یہ تو ہوئیں حقیقیں کی مثالیں، متھن کے لخت لخت تراجم کے علاوہ جب عزیز احمد نے ٹی۔ ایس ایلیٹ کی زندگی میں ان سے باقاعدہ مشورہ کر کے "ولٹ لینڈ" کا ترجمہ "خراب آباد" کے عنوان سے پیش کیا اور میرا جی نے "مشرق و مغرب کے نئے" مرتب کی تو جدید مغربی شاعری کی طرف درتیجے وا ہو گئے۔ اب جماں شوکت واسطی نے ملن کی "بیرا ڈاکٹر لاست" کا ترجمہ "فردوس گم گشتہ" کر سو فر ما رو، کی "زیبک لائف آف ڈاکٹر فاسٹس" کا ترجمہ "المیہ حکیم فسطاس" دانتے کی "ڈیوا میں کامیڈی" اور ہومر کی "ایلینڈ" کے پچھے دفتر

ترجمہ کے دیں مغرب کے اہم نظریہ ساز شعراء از قسم بودیز، رین بو اور طاہر بن جلوں کو تھیں
بابری نے ترجمہ کر دیا۔ یہاں تک کہ ایزرا پاؤ نڈ، لور کا، رابن داریو، پالبو نرودا، بریخت، سلویا
پلاچھ، خورخے لوکس بورخیں اور اوکتاپاوز تک نئے اور اہم نام ترجمہ ہو چکے۔ انحالوں جیز کی سلسلہ
پرشان الحق حقی کی مرتب کردہ "درپن درپن" آخری قابل ذکر چیز ہے۔

یہ تو ہوا ایک مختصر جائزہ۔ تفصیل میں جائیں گے تو بقول فراق، یہ قصہ طولانی ہے۔
اویباتِ عالم میں ترجیح کے ذریعے اخذ و استفادے کا انقلاب آفرس سلسلہ جاری و ساری ہے۔
اب دیکھنا پڑے ہے کہ ہم ترجیح کے تمن کے بعد گیراڑات کو کس طرح قبول کرتے ہیں۔ پیروی
مغرب بھی بہت ہو چکی۔ مغلی پئے کے زیر بار احسان ہوئے ایک زمانہ بیت گیا۔ ان تراجم کو
پڑھئے اور سوچیجئے، کیا ہم اب بھی ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ ہمیں کیجاگری کی
طرف جانا ہے؟

مرزا حامد بیگ

ابتدائیہ: نر ناری

”جس شجر حیات کی جڑ ہے۔ ہم زندگی کا احترام اس وقت تک نہیں کر سکتے۔
جب تک کہ ”ہم جس“ کا احترام کرنا نہ یکھیں۔“

(ڈاکٹر ہبیو لاک ایمس)

شرق اور مغرب کے مذہبی مفکرین کا خیال ہے کہ مرد صاحب فرم و فراست ہے
ہے روز اول سے صاحب اقتدار پیدا کیا گیا ہے۔ اور عورت ناقص العقل ہے جو ازل
سے ملکوم رکھی گئی۔

دوسرा نظریہ یہ ہے کہ دور جمالت میں عورت ضرور صاحب اقتدار رہی لیکن مرد
کی بغاوت نے اس کے اقتدار کو گزنا دیا۔ لہذا مرد کا اقتدار کبھی نہ ختم ہو گا۔ اس نظریہ
کے حامل لوگوں میں جرمن فلاسفہ نے (نیٹش) خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ وہ لکھتا ہے:
”حقائق ہاتے ہیں کہ عورت بیشہ سے ملکوم نہیں رہی بلکہ اکثر اقوام میں وہ حاکم رہی
ہے، لیکن یہ محض اتفاق ہے۔ وگرنہ عورت یہ درجہ کبھی حاصل نہ کر پاتی۔“

تیسرا نظریہ جدید ترین مفکرین کا ہے۔ خاص طور پر ان اصحاب کا، جو حقوق نسوان
کے ضمن میں مغلوب عورت کی کامیاب جدوجہد کے نتائج دیکھے چکے ہیں۔ ان کی نظر میں
عورت کی یہ جدوجہد بالآخر برابری کے حقوق منوالے گی۔
لکھنی عجیب بات ہے کہ تینوں آراء میں کسی نہ کسی طور مرد کی برتری ثابت کی
جا رہی ہے۔

..... پلا خیال اتنا فرسودہ اور غیر منطقی ہے کہ اس پر بحث بے کار ہے۔

..... دوسرے نظریہ میں یہ تو تسلیم کیا گیا کہ عورت حاکم رہی، لیکن اس زمانے کو دور جمالت شمار کیا گیا۔ اب کے خبر کہ وہ دور جمالت کتنے ہزار سالوں پر نجیط تھا اور کتنی تند ہنسی عروج پا کر مت گئیں، اور ان گشیدہ تنہیوں میں نر یا ناری، کس کا اقتدار رہا؟ کون جانے۔ ہماری پہنچ تو زیادہ سے زیادہ فرانسیسی ماہر ارضیات کونت جارجز دے فون یا فرانسیسی ماہر معدومیات نیشن جان کوئے کے ”نظریہ حادثات عظیم“ تک ہے جو کیسا کے نظریہ ”تجلیق عالم“ (۳۰۰۲ قمل مسح) کو مزید اسی ہزار برس پیچھے دھکیلا دیتے ہیں۔ یا پھر انہیں بھی روکرنے والے علم بشریات کے محقق و نیم ہاویل ہیں جو موجودہ انسان کے سفر کی دو کروڑ سالہ پرانی کمائی سناتے ہیں۔

آب آئیے، معدومیات، بشریات، ارضیات اور سماجیات کی تجربہ گاؤں اور دانش کدوں کو سرسری طور پر جھانک لیں۔ یہے دلچسپ حقائق سامنے آتے ہیں۔ یعنی مادر سری نظام میں مرد عورت کے تابع تھا۔ اور پدر سری نظام میں عورت مرد کے تابع ہے۔ مادر سری نظام میں مرد کی حالت وہی تھی، جو پدر سری نظام میں عورت کی ہوئی۔ واضح رہے کہ قدیم ہرا، مصر، یونان اور افریقہ میں عورت کا اقتدار (مادر سری نظام) مسلم امر قرار پا چکا ہے۔

بانگل کے مطابق اس دنیا میں اتنے والے پسلے جوڑے میں عورت کو عاشق کا درجہ حاصل ہے۔ یوں قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ابتدائی مادر سری نظام سے ہوئی۔ اس کے بعد پدر سری نظام آیا اور یوں نیہ سلسلہ چلتا رہا۔ آخری معلومہ مادر سری نظام کی عشقیہ نظمیں دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ اس وقت عورت مرد سے اختمار محبت میں پل کرتی تھی۔ اور بقول ملر: ”عورت، مرد کو اپنے قبضہ میں رکھنے کے لئے شراب پلانے سے بھی گریز نہ کرتی تھی۔“

اس وقت طلاق دینے اور وراثت کے حصول کا حق صرف عورت کو حاصل تھا۔ مرد رکھیں اور دلکش لباس پہننا اور شادی ہونے پر اپنے ساتھ جیز لاتا تھا۔ مشہور تاریخ دان ارمن لکھتا ہے: ”محمد قدیم میں مصری لوگ الٹی کھوپڑی کے معلوم ہوتے ہیں۔ مردوں کے لباس میں تو طرح طرح کے فیشن ملتے ہیں، جبکہ عورتوں کا لباس صدیوں تک ایک عی جیسا دلکھائی رہتا ہے۔“

قدیم کیوں اس قبیلے کا یہ قانون تھا کہ جو مرد شادی کے وقت اپنے ساتھ زیادہ جیز نہ لائے، اسے بیوی کا غلام بن کر رہتا پڑے گا۔ اس دور میں بچوں کے نام، ماں کے نام سے وابستہ ہوا کرتے تھے۔ عورت کے ذمہ معاش کا انظام تھا اور مرد لوگ مگر اور بچوں کی تعداد کیا کرتے تھے۔ اس وقت عورت کی حاکیت تھی۔

قدیم ہند کے منو مہاراج کی تحریریں اس بات کو پایہ ثبوت تک پہنچاتی ہیں کہ ہندوستانی عورتوں کو اپنے شوہروں کے انتخاب میں مکمل آزادی تھی۔ جیکل کے مطابق قدیم آسام (ہندوستان) میں جب کوئی عورت کسی مرد سے انہمار محبت کرتی تو مرد اپنی عصمت کی خلافت کی خاطر عورت کی زد سے بچتے کی خاطر بھاگ نکلا۔ یہاں تک کہ پکڑا جاتا۔

قدیم یونان سے متعلق ہیرودوٹس لکھتا ہے: "لیڈیا میں مرد اپنے جسم کی عربانی پر شرم سے پانی پانی ہو جاتے تھے اور جوان لڑکیاں نیم عربان حالت میں کشتی لڑا کرتی تھیں۔"

جس طرح آج کا مرد عورت کو بزدل سمجھتا ہے، اسی طرح گزرے ہوئے کل کی عورت، مرد کو بز دل تصور کرتی تھی۔ میدان جگ میں عورتیں لڑتی تھیں اور ایک عورت کی لکار پر دوسری عورت مقابلہ پر اترتے ہوئے کہتی تھی: "تم مجھ سے مقابلہ کرنے آئی ہو...؟ جاؤ، کسی اور کو بھیجو تم تو مرد ہو۔"

اسی نظر میں دیکھیں تو حسن و ادا، عشوه و غزہ، عصمت و عفت، شرم و حیا، شجاعت اور دیری کو کسی ایک جنس کے ساتھ منسوب نہیں کیا جا سکتا۔

ہندوستان کے پدر سری نظام میں جس طرح "ستی" کی رسم کے مطابق بیوہ کو مردہ شوہر کے ساتھ جلا دیا جاتا تھا، اسی طرح مادر سری نظام میں بیوی کی موت پر شوہر کو زندہ دفن کر دیا جاتا رہا ہے۔

یونان میں ایک شادی کے قدیم عہد نامہ میں درج ہے: "اگر میں تم سے نفرت کرنے لگوں اور دوسرا مرد کو چاہنے لگوں تو میں تم کو طلاق دے دوں گی اور اس کا توان ---"

قدیم افریقہ کی عورتوں کے حرم اتنے ہی مشور ہیں جتنے کہ پرشیا کے شاہوں کے

حرم۔ حرمت کی بات ہے کہ میاں بیوی کی خلافت عمر کا مسئلہ اسی رنگ میں رٹھا دکھائی رتا ہے۔ یعنی جو صفت بھی حادی اور با اختیار ہوگی، اس کے نمائندے اپنے، اپنی سوتیں جیات سے عمر میں بڑے ہوں گے۔ اگر مرد کا اقتدار ہے تو شوہر کم عمر لوگوں سے شادی کرتا ہے اور کر سکتا ہے۔ اسی طرح اگر عورت کا اقتدار ہے تو وہ کم عمر مردوں سے شادی کرتی ہے یا کر سکتی ہے۔

یاد رہے کہ قدیم اسپارٹا میں غیر شادی شدہ مردوں کو شری حقوق بھی حاصل نہ تھے۔ یوں کما جا سکتا ہے کہ جنسی اخلاق بیشہ دوغلاسی رہے گا۔ خواہ مرد کا اقتدار ہو یا عورت کا۔ ارباب اقتدار اپنی سولت کی خاطر اپنے حقوق و فرائض کا تعین کریں گے۔ نتیجہ میں ملکوم صفت بیشہ محرومی کا شکار رہے گی۔

حاکم صفت نے بیشہ اپنی عیاشی کے لئے عصت فروشی کے بازار جائے اور ملکوم صفت اپنے جسم فروخت کرتی رہی۔ پور سری نظام میں عورتوں کو عصت فروشی پر مجبور کیا گیا اور مادر سری نظام میں مردوں کو۔ یعنی ہر دو ادوار میں عصت فروشی کو ایک ضروری لعنت قرار دیا گیا۔ مصر، اسپارٹا اور عرب کی تواریخ بتاتی ہیں کہ مادر سری نظام میں جب عورت صاحب اقتدار تھی تو ایک بھی عصت فروش عورت دیکھنے کو نہ ملتی تھی۔ جبکہ عصت فروش مردوں سے بازار بھرے ہوئے تھے۔

اسی طرح ہر دو ادوار کے مصوری کے شاہکار ملاحظہ کیجئے۔ قدیم مصر میں جب مادر سری نظام رائج تھا تو مصوری کے اکثر شاہکاروں میں ملکوم صفت یعنی مردی کو اس کے ہر زاویہ سے دکھایا گیا ہے۔ جبکہ حاکم عورت کی جس کو مصوری میں ظاہر نہیں کیا گیا۔ اسی طرح پور سری نظام کے شاہکار دیکھئے، ان میں ملکوم عورت کس کس طور پر جلوہ گر نظر آتی ہے۔ سو معلوم ہوا کہ جس مخالف کو بیشہ جنسی مقصود کے روپ میں دیکھا جاتا رہا۔ یوں بڑی آسانی سے لگ پوچا اور ملک زہر کی وجہ معلوم کی جا سکتی ہیں۔ آخری معلوم مادر سری نظام میں لگ پوچا اپنے عوچ پر تھی۔ اس کی ابتدا مصر سے ہوئی۔ لگ کے قدیم مجتہ بھی مصر سے ہی دریافت ہوئے۔ یقیناً یہ رسم مصر سے پہنان، اطالیہ، اور ہندوستان میں پھیلی۔ اس دور میں عورتیں لگ دیوتا کے طفے گلے میں لٹکائے پھرتی تھیں اور لگ مندروں میں عورتیں ہی داسیاں بنتی تھیں۔ اسی طرح

ملک زہرہ کی پوجا، مردوں کے اقتدار کی یادگار ہے۔

پدر سری نظام کے ہندوستان، یونان اور روم میں ملک زہرہ کا بہت زور رہا ہے اس زمانے کے مندروں میں مرد اور عورتیں دوفوں داس اور داسیاں رہے۔ چونکہ زہرہ دیوی اپنے مرد پیاروں کی تسلیم کی اہل نہ تھی اس لئے جتنی جائیں عورتیں، دیوی کی جگہ خود کو پیش کرتی تھیں۔ آج بیشتر تنہیب یا غصہ ممالک میں ان دوفوں اقسام کی پوجا منوع قرار پائی ہے۔ پھر بھی ہندوستان میں لگایت قوم لگ دیوتا کی پوجا کرتی ہے اور جلوس نکالتی ہے۔ زہرہ آج بھی محبت کی دیوی ہے۔ کپوڈ، مردوں کی صفت سے متعلق تو ہے لیکن آج تک اسے پچھے دکھایا جاتا ہے۔

ماہر بشریات فرانسوا بورڈ لکھتا ہے: "افریقہ میں جدید تحقیقات کے نتیجہ میں معلوم ہوا ہے قدیم مجری عمد، آج سے دو لاکھ سال قبل شروع ہوا..... مجری عمد کے ابتدائی ایام میں آداب تجیز و تکفین خاصے پر تکلف تھے۔ مردوں کے ساتھ اس عمد کی تبیتی اشیاء بھی دفن کی جاتی تھیں مثلاً سمجھ چشمک اور ہڈیوں سے بننا ہوا سازو سامان، گھوٹکے اور سیپ کے بننے ہوئے ہار اور گیرو کا پاؤڑر میت اور سازو سامان پر چھڑکا جاتا تھا..... زنان قبرستانوں یا قبروں میں اسی قدر تبیتی اشیاء ملتی ہیں جتنی مردوں کے ساتھ پائی گئی ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا دشوار نہیں رہتا کہ قدیم مجری عمد کا شکاری انسان صفتی امتیاز سے بے خبر تھا اور اس معاشرے میں عورت، مرد کی ہمسر خیال کی جاتی تھی۔"

غیر یہ برابری تو ہوئی دو لاکھ سال پہلے کی بات۔ اس سے پہلے کیا تھا؟ اور اس کے بعد کیا ہوا.....؟

سکندر اعظم نے جب مصر فتح کیا تو اس وقت تک مصری مرد اپنے حقوق کی وجود میں اس قدر کامیاب ہو چکا تھا کہ شادی کے عمد نامہ میں اس کا ذکر کیا جانے لگا تھا اور وراثت میں مرد حصہ دار بن چکا تھا۔ اس کے بعد پدر سری نظام آتا ہے اور یہ منظر نامہ آپکا دیکھا بھالا ہے۔

یورپ کے پدر سری نظام کو پھر ایک جنینگ کا سامنا ہے۔ عورت برابری کے حقوق حاصل کر چکی ہے۔ اب اگلا قدم جانے کدھر پڑے؟ البتہ ہمارے ہاں ابھی حقوق نہیں

کی بات چلی ہے۔ یہاں کی عورت ملکوم اور کمزور ہے، جسے بڑی طرح کچلا گیا ہے۔ یہ عورت گرتی پڑتی آگے اور آگے بڑھتی چلی آتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہاں حقوق کا حصول انسانی زندگی کو کیا خنی کروٹ دے گا۔

زیادا تاریخ نہ تو ہمیشہ سے مظلوم چلے آتے ہیں اور نہ ازل سے ملکوم۔ لیکن یہ دنوں ہیں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزم۔ ہمارا موضوع جس نہیں۔ اس کتاب میں اپنے دیکھنے بھالے پور سری نظام کی مختلف نفسی وارداتیں جمع کرنے کی سعی کی گئی ہے اگر آتے والے دور کی کوئی بہت گھناؤنی تبدیلی اپنی مطلق الخانست کی طرف بڑھتے ہوئے یہ منظر نامے بھی دیکھ لے اور باز رہے اس اتنا پندی سے جس کا انجام انسانی محشرے کو بالآخر ایک بہت بڑی کروٹ دے دیتا ہے۔

مرزا حامد بیگ
مخل سرائے، بھلی گھر روڈ، ایک شر

ایو سے نکول: تعارفیہ

سیرا یون (افریقہ) کے عالمی شہرت یافتہ افسانہ نگار اور شاعر ایو سے نکول ۱۹۲۳ء میں سیرا یون میں پیدا ہوئے۔ سیرا یون اور ناگھڑا میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کیمبرج یونیورسٹی سے نجپل سائنسز میں ایم۔ ایس۔ سی۔ کیا اور بائیو کیمیسٹری میں رسروچ فیلو رہے۔

وطن واپسی پر بطور سینٹر پچالو جھٹ ملازمت کا آغاز کیا۔ ۱۹۶۱ء میں میڈیکل سائنس سے متعلق یونیسکو کے زیر اہتمام بوشن میں ہونے والے سینیار میں اپنے وطن کی ناسخنگی کی۔ ۱۹۶۹ء میں یونیورسٹی فوراہ بائی کالج سیرا یون کے پرنسپل تھے۔

ایو سے نکول کے افسانے، نظمیں اور تقدیمی مضامین یورپ اور امریکہ کے مقدر جرائد خصوصاً "ان کاؤنٹر" "ٹائمز" "اکاؤنٹر" اور "مگر جین" میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کی شاعری اور افسانوں میں افریقی مذاہب کی خوبصوری ہوئی ہے۔ ہیروں اور لوہے کے ذخائر سے پر سیرا یون کی مخصوص نفیات اور کائنات کے مختلف مظاہر کے مقابل انسانی جدل کا مطالعہ ان کا خاص موضوع ہے۔ ایو سے نکول کی مطبوعہ کتب میں "افریقہ: ایک نفسی نگارہ" (مطبوعہ: ۱۹۶۳ء)

"پڑھو اور جاؤ" (مقالات) "کالے افریقہ کی نظمیں" (مطبوعہ ۱۹۶۳ء)

"ایک افریقی خزانہ" (کتابی) مطبوعہ: ۱۹۶۰ء خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔

ایو سے نکول کو ۱۹۵۲ء میں MARGARET WRONG PRIZE اور میڈل برائے ادب سے نوازا گیا۔

سیرا یون کا یہ افسانہ نگار، افسانوں کی متعدد ایک نیشنل انتھالو بیز میں افریقہ کی ناسخنگی کرتا دکھائی دیتا ہے۔

مرزا حامد بیگ

ایو سے نکول، مرزا حافظ بیگ

زندگی حسین ہے

اس کی ایک جانب سمندر اور نم ریت ہے، تو ہرے بھرے خود رو جنگلات دوسری جانب اور اوپر دیسخ کے ساتھ متذلا تے ہوئے بادل۔ آنکھوں کو خیرہ کر دینے والا سورج کا شفاف طشت اور آسمان کی نیلی چھتری، اس مختصری افریقی آبادی "کامینی" کے چوگرد احاطہ کئے ہوئے ہے۔

خود نما چھتوں والے چوکور کچے مکان مٹی سے لپے ہوئے ہیں جبکہ چند ایک کی بھری ہوئی جست سے ڈھکی چھتیں "کوکوا مشروب" کی تجارت میں صاحب خانہ کے استھان کی نشاندہی کرتی ہیں۔

بوڑھی یوہ بولا نے روغن ناریل کے پکتے ہوئے شوربے کو ہلایا، اور بے وحیانی میں خیال کیا۔ وہ اپنے مضبوط، بے دانت کے جبڑوں کی مخصوص تال کے ساتھ ناریل کی گری چباری تھی۔ پھر یا کیک اس کے جبڑوں کی جنسیں، اس کی پوچی آئی کے ری پھلانگتے کی آواز سے ہم آہنگ ہو گئی۔ اس نے خالی خالی نظروں سے سات سالہ شخصی آئی کی جانب دیکھا، جو بڑی چا بکدستی سے ناریل کے چتوں کی ہٹی ہوئی ری کو ہر بار اپنے سر سے گزار کر، زمین سے چھواتے ہوئے اور سرفی ماکل گرد اڑاتے ہوئے انگریزی میں نمبر شمار بھی کر رہی تھی۔ یوں تو بولا زیادہ انگریزی نہیں جانتی تھی، لیکن روز مرہ کے لین دین کی خاطروں میں تک تکنی گن ہی لیتی تھی۔

آئی بلند آواز سے پکاری "چھ" اور پھر گئنے لگی تو —— دس —— گیارہ ——

بولا نے نوکتے ہوئے کہا "بھی چھ کے بعد سات —— ارے اعا تو میں بھی جانتی ہوں۔" اس نے مختنڈی آہ بھری۔

ہر چند کہ اب وہ بوڑھی ہو گئی تھی اور اس کی کوکہ اور چھاتیاں سوکھ چکی تھیں، لیکن ایک وقت تھا جب اس نے ہر دو سال بعد تو اتر سے بچے ہوئے تھے۔ چھ بار اس کے نسخہ اولاد ہوئی اور ہو کر مر گئی۔ بخشہ تو غائب آیز اپھارے سے کلاتے ہوئے بیت گئے اور باقی چھپاتے ہوئے جسموں کے ساتھ، تشنج کی حالت میں آنکھیں چڑھائے مر گئے۔ سب کے سب گزر گئے۔ یوں چیسے وہ الگ الگ نہ تھے، ایک ہی تھا، اس نے خیال کیا۔ اسے یقین تھا کہ ایک ہی بے جمیں روح تھی جو ہر بار اس کی کوکہ میں جنم لینے کو کلبلا تی اور اس کا حسر اڑاتی۔ چھٹی بار موئی نے، جو گاؤں کا ایک جادوگر تھا اور جسے وقت نے ایک معزز مسلمان میں بدلتا تھا، اسے اور اس کے شوہر کو مشورہ دیا تھا کہ نوزائدہ مردہ بچے کی بھر بھری ہڈیاں توڑ مرودی جائیں، تاکہ اس کی آنما بار بار جنم لے کر انہیں انتہ سے دوچار نہ کرے۔ پر اس نے بچے کو بھینچے رکھا تھا اور انہیں ہاتھ تک نہ لگانے دیا تھا۔ اس سے پلے کہ بچے کو چٹائی میں لپٹنا جاتا اور وہ اسے لے جاتے، اس نے بچے سے اس کے بائیں کو لے کو فوکدار چڑی سے نشان نہ کر دیا۔ جب ساتویں بار اس نے بھر بیٹا جتا تو ولادت کی رسوم کے بعد یہ دیکھنے کے لئے کہ نشان ہے یا نہیں اس نے بڑے طریقے سے بچے کو اٹایا۔ نشان موجود تھا۔ اس نے بوڑھی دایہ کو دکھایا اور اس کے بارے میں استفسار کیا تو اسے دایہ کی یہ بات مانتے ہی بیٹی کہ نشان اتفاقی ہے اور ان جڑی بوٹیوں کی رگڑ سے آیا ہے جن سے رطوبت سے بیٹھنے ہوئے بچے کو صاف کیا گیا تھا۔ لیکن یہ بچہ زندہ رہا اور صحی کھلایا۔ اور یہ کہ اب وہ تمیں برس کا تھا اور نوے میل پرے ایک قبھے کے سرکاری دفتر میں درجہ دوم کا کلرک تھا۔ نسخی کپی اسی کی بیٹی تھی، جسے اس نے اپنی بوڑھی ماں کی سپرد داری میں دے رکھا تھا کہ وہ بڑھیا کے چھوٹے مولے کام کرے، آس پڑوس میں دوڑ دوڑ کر بیغام رسالی کرے، باورچی خانے میں دھرے ملکے سے بھر لائے اور اپنی دادی کے ساتھ چھٹ کر سوئے۔

اس نے پچکی بھر تک اور دھلے ہوئے کساوے کے پڑھے ہوئے پتے الٹتے ہوئے سالن میں ڈالے اور اس کے بعد دہنی پر سنبھل کر قدم رکھتی، تک مرچیں لانے اندر چلی گئی۔ اس نے مرچیں ڈھونڈنے کا لیں لیکن بچے گیر دیں اور دیوار کا سارا لینے کے باوجود کراہتے ہوئے لڑکھڑا کر رہ گئی۔ اس گھڑی، کھڑکی سے پلتے ہوئے، چاہت اور دکھ ملی خفیف مسکراہٹ کے ساتھ بھی نے اس کی جانب نگاہ کی تھی۔

وہ اپنی آدمی آئین کی کھلے گلے والی سفید قیص اور سلیٹی گباؤں کی پتوں، بازو کی طلائی گھری اور صابر کے بھورے جوتوں میں من دعن افریقی رسائل کے اس وجہہ لکر کی شبیہ تھا، جو محض اس نے ترقی کی متازل طے کرتا چلا جاتا ہے کہ اچھا کھاتا ہے اور مشترکی جانے والی قبض کشا دوا ہا کا استعمال بھی باقاعدگی سے کرتا ہے۔ اس کی رنگت خاکستری مائل بھوری تھی، اور وہ گرون کے گرد ایک بڑا سرغ رومال پاندھے ہوئے تھا۔

”بھی۔۔۔ شکر خدا کا“ بولا چلا اُنھی: ”تو نے تو مجھے ڈراہی دیا تھا۔ بھی میں کمزور دل ہوں، اور اب اس قابل نہیں رہ گئی ہوں کہ تو مجھے یوں اپنھے میں ڈال دے۔ کب آئے...؟ کیسے پہنچے..... لاری پر، ماہی گیروں کی کشی پر...؟ گھر میں کیوں کر داخل ہوئے...؟ باہر تو کواڑ میں تالا پڑا تھا۔ چوروں کی بہتات ہے ان دنوں۔ میں اتنی خوش ہوں، مجھے دیکھ کر اتنی خوش ہوں۔“ وہ اپنے بیٹے کے سینے پر سر رکھے، لاکھڑاتی ہوئی زبان میں بولی اور بالآخر رو اُنھی۔

بھی کی آواز رندھی ہوئی تھی، اس نے کہا "میں بھی بہت خوش ہوں، ماں۔" اس نے پیار سے ماں کی کمر پھٹپھٹایا۔

"پاپا۔۔۔۔۔ پاپا" کہتی ہوئی آسی دوڑی دوڑی آکی اور مجھی نے اسے اپنی باتوں میں بھر کر گلے سے لگا پا۔

”اے جانے دو ماں، کہ میں کیسے پہنچا۔ میں یہاں ہوں، اور کیا یہ کافی نہیں؟“ مجھی نے پختہ ہوئے کہا۔

”بس بس۔“ بھی نے فضا میں ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا: ”یہ سب غیر ضروری ہے۔ مجھے کسی سے نہیں ملنا، کسی سے بھی نہیں۔ میں تو بس آرام کرنا چاہتا ہوں، مکمل آرام۔ یہاں میری موجودگی کی کسی کو خبر نہیں ہونی چاہئے۔“

بولا انتہائی شکستہ خاطر دکھائی دینے لگی۔ مجھی تو اس کا فخر تھا اور وہ اسے دنیا والوں کو

دھانا چاہتی تھی۔ اتنے اہم مہمان کی آمد سے بے خبری پر گاؤں کے لوگ اسے کبھی معاف نہیں کریں گے۔ مجھی کو اس بات کا احساس ہو چلا تھا۔ اس نے اس نے اپنی ماں کے کندھوں کو نزدی سے تھانے ہوئے کہا: ”انہیں بہت جلد پتا چل جائے گا۔ کیوں نہ ہم یخوں ایک دوسرے کی خاطر مل بیٹھیں، گھری دو گھری۔ زندگانی منحصر ہے۔“

بولا، آسی کی جانب مری، مرچ کی پڑیا انعامی اور اس میں سے چنکی بھر، باہر الجتی ہوئی ہندیا میں ڈال آنے کو کما اور تاکیدا ہگ کے قریب جانے اور اس سے کھیلنے کو منع کیا۔ آسی کے چلے جانے کے بعد اپنے بیٹے سے بولی: ”کسی مصیبت میں ہو....؟ پولیس کا معاملہ تو نہیں...؟“ اس نے سر جھکا ”نہیں تو۔“ وہ بولا۔ ”صرف یہ کہ تمہاری طرف پلٹنے کو ہی چاہا تھا۔ یہ صرف ہماری محبت کا بہاؤ ہے اور اس میں میں کسی اور کو شریک نہیں کر سکتا۔ یہ ہمارا آپس کا معاملہ ہے، اور اگر ایسا نہ ہوتا تو اپنی بھی بیٹی تمہارے پاس کیوں چھوڑتا۔“ اس نے بے عکی ہوئے کہا: ”عموں لڑکیاں اپنے قریبی رشتہ داروں کے رہ لیتی ہیں۔“

”لیا مجھے اس بات کا علم نہیں ہے۔“ بولا بولی: ”لیکن تمہارا رنگ زرد پڑ گیا ہے۔“ اس نے اپنی بات جاری رکھی: ”----- اور تم اپنی گروں کو تھانے ہوئے ہو۔ کیا بیکار ہو...؟“ اس نے مجھی کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”----- اور تمہارا جسم بھی مختذا ہے۔“

”باہر ہوا،“ مرتکب اور سرد ہے۔ مجھی نے قدرے درستی سے کہا: ”اگر تم میرا کمرہ کھول کر صاف کر دو، تو میں ذرا آرام کر لوں۔ میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ تھکن سے چور ہوں۔ میں نے آج ایک طویل سفر کیا ہے، اور یہ کوئی آسان سفر نہ تھا۔“

”بے شک بیٹے، بلاشبہ۔“ بولا نے وہاں سے بنتے ہوئے، تیزی کے ساتھ لین سرت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

مجھی تمام دوپہر، شام پڑے تک سوتا رہا اور اس کی ماں اس کے لئے کمرے میں ہی کھانا لیتی آئی اور ازاں بعد خالی چپچپی وہاں سے واپس انعاماً لے گئی۔ وہ ایک بار پھر سو گیا اور پوچھنے تک سوتا رہا۔

اگلا روز، سپتھر تھا جو ایک مصروف دن ثابت ہوا۔ بولا مجھی سے اپنے اس وعدے کا لحاظ رکھتے ہوئے کہ اس کے آنے کی خبر کسی کو نہیں کرے گی، بازار کے لئے نکل کھڑی ہوئی۔ مجھی نے ایک لمبی سرکی خاطر، آسی کو اپنے ساتھ لیا اور ویران راستے سے ہوتا ہوا پہاڑیوں کی طرف نکل

گیا۔ آئی خوشی سے پھولے نہیں ساری تھی۔ وہ بلندیوں کی طرف نکل گئے، یہاں تک کہ خیب میں سارا گاؤں ان کے سامنے تھا۔ اور دور فاصلے پر سمندر اور کھلے بادباؤں کے ساتھ کشتاب، ابھی کچھ ہی دری پہلے، سورج نے دن کے دو پہر کمل کئے تھے اور مغرب کی طرف اس کا آر جا سفر ابھی رہتا تھا۔ آئی، اس وقت تک تمام خوردنی اشیاء، جیسے خلک، پھل، جنپتے خانہ سازیک، اور غذے کھا چکی تھی۔ اس کے باپ نے بتایا تھا کہ اسے بھوک نہیں اور آئی کے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات کیا ہو سکتی تھی۔ وہ چھکتی رہی، کھایا بھی اور اس کے بعد باپ کی جیب سے برآمد ہونے والے فاؤٹن ہین اور دیگر اشیاء سے کھیلتی رہی۔ اس کے بعد انہوں نے جلد ہی گھر کی راہ لی، اس لئے کہ بیوی نے انہیمرا چھا جانے سے پہلے گھر پہنچنے کا وعدہ دے رکھا تھا۔ وہ چھاؤں کی سیدھی تراویوں سے اترے وقت آئی کو اخاء ہوئے تھا، اور وہ اس کے کندھوں سے چھپی ہوئی تھی، اس لئے کہ بیوی نے اپنی گردن کو زخمی بتایا تھا اور کما تھا کہ اسے نہ چھوا جائے۔ آئی نے کہا تھا: ”پاپا، میں تمہارے پیچے دیکھ سکتی ہوں، لیکن تمہارا سایہ نہیں ہے۔ ایسا کیوں ہے...؟“

تب وہ اسے گھما کر سورج کے سامنے لے آیا۔ جب سے آئی اوچھنے گئی تھی، اس نے سوالات شروع کر دیے تھے، جواب میں اس کے باپ نے چھیڑ چھاڑ اور نہیں مذاق شروع کر دیا تھا۔

”پاپا تمہاری گھری بارہ پر رک کیوں گئی ہے....؟“

”اس لئے بیٹا، کہ دوپہر کو دنیا کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔“ آئی یہ سن کر گھنکے گئی تھی۔

”پاپا، آپ بیٹھ گلے میں سکارف کیوں باندھے رہتے ہیں...؟“

”اس لئے بیٹا، کہ ایسا نہ کرو تو میرا سر الگ ہو کر گر پڑے۔“ وہ اس پر کھلکھلا کر نہ دی تھی۔ لیکن کچھ ہی دری میں وہ سوچکی تھی اور اس کا باپ اسے اخاء ہوئے گھر کی جانب روائ تھا۔

رات پڑنے سے کچھ ہی دری پہلے، بھرپور کپڑوں میں لمبیں ماں کے فوری اسرار پر وہ تھیوں، آبادی سے بچتے چھاتے ایک خیہ راتتے سے بیوی کے مرحوم باپ کی قبر تک گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا قبرستان تھا، جو یقیناً میں سال یا اس سے زیادہ پرانا نہیں تھا، اور یہ اس وقت قائم کیا گیا تھا جب ویسی صحت عالمہ کے شعبے نے اس بات پر زور دیا تھا کہ اب کسی کو بھی گھروں کے

پچھاڑے نہ دلایا جائے۔

بولا اپنے ساتھ ایک شراب کی بوتل، ایک گلاس اور چار عدد کئے ہوئے ناریل کے کھوپے اٹھائے ہوئے تھی، ثم قوس میں راشے گئے ناریل کے دد رخ اور دو سفید ٹکڑے۔ وہ قبر تک پہنچ گئے تو بولا نے کچھ شراب گلاس میں انڈیلی۔ پھر اس نے مرhom سے شفقت بھرے زم لجئے میں کہا کہ وہ اس کے بیٹے کو اپنے ساتھ لےئی آئی ہے، اور یہ وہ تھا جسے خدا نے عروج بخشنا تھا، اور دشمن زیر تھے۔ یہ وہ تھا جسے پشن والی کلرکی ملی تھی نہ کہ وہ ایک سکان، مجھرا، یا مستری تھا۔ ان کی تمام تر ازدواجی زندگی میں لوگ اسے محض اس لئے چڑیل کتے آئے تھی کہ اس کے جنے ہوئے پچھے جی نہیں پاتے تھے۔ لیکن اس پچھے نے اسے نیک بخت ثابت کیا تھا۔ اب تو اس کے خاوند کو ہواب رضاہی چاہئے ہا، یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ واقعہ سن رہا ہے۔

اس نے ناریل کے چاروں کھوپے ہوا میں یوں اچھا لے کہ سمجھی اس کی قبر پر آرہے۔ تین کئے ہوئے رخ کے ساتھ اور ایک اونڈھے موئہ۔ بولا نے انہیں ایک بار پھر اٹھایا، ایک مرتبہ پھر مرhom سے کچھ کما سنا اور ناریل ہوا میں اچھال دیے، لیکن ہر بار ان میں سے کوئی ایک، یا ایک سے زائد اونڈھے موئہ نہیں رہا۔

ایسا نمکن نہ ہو سکا کہ وہ چاروں اپنے کئے ہوئے رخ کے ساتھ گرتے۔ یا چاروں اونڈھے موئہ، تاکہ یہ اندازہ لگایا جا سکتا کہ وہ بات سن رہا ہے اور اسے اس بات سے خوشی ہوئی ہے۔ بولا نے پیار بھرے بجے میں پوچھا، اس نے ٹکوہ کیا، اس نے درشت لجھ اپنایا، مگر سب بے سود۔ تب اس نے سمجھی سے کہا کہ وہ عمل دو ہرائے۔ اس پر وہ قبر کے پہلو میں سوت کر پہنچ گیا اور بیڑا لیا۔ پھر اس نے ناریل کے پیالے اچھال دیے۔ جو کہ گر کر دیہ تک گھوما کئے، بولا انہیں اپنی بوڑھی مجھس نظروں سے گھوٹتے ہوئے دیکھتی رہی۔ جب وہ تھے تو سب کے سب اونڈھے موئہ تھے۔ سمجھی نے شراب بھرا گلاس قبر پر انڈیل دیا اور بدبدایا کہ وہ اس گھڑی اپنے باپ کو جس قدر قریب محسوس کر رہا ہے، زندگی بھر اتنا قریب محسوس نہیں کر پایا۔

اس وقت سورج ڈوب چکا تھا، پھر وہ تیتوں ماند پڑتے ہوئے دھنڈ کئے میں چپ چاپ اپنے گمرا کو لوٹ گئے۔ اس رات گمرا سے باہر جاتے ہوئے بولا، اپنے بیٹے کے کمرے کی گھر کی کے پاس یہ دیکھ کر ازانت بھر جیت سے دوچار ہوئی کہ سمجھی اپنے حصے کا کھانا بغیر کھائے باہر بچھکتا رہا تھا۔ جب وہ اسے شب پتھر کئے کے لئے گئی تو اس نے اس بات کا ذکر تک نہیں کیا، البتہ اشارہ ناکچھ

سوگھتے ہوئے یہ ضرور کما کہ کمرے میں سڑاک دی اٹھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ مجھی بولا کہ اس کے خیال میں تو چھت کی کڑیوں میں کوئی مرا ہوا چھا ہے اور یہ کہ رات سونے سے پہلے اے نکال پھیکے گا۔

اس رات زوروں کی بارش ہوتی رہی تھی، آسمان پر روشنی کی چادر پل دوپل کے لئے رات کے اندر حیا رے کو چاندی بھیسے سورے میں بدلتی رہی۔ اس کے بعد پھر وہی اندر حیا را اور بارش۔ نصف شب کو بولا جائی تو اسے یوں لگا جیسے کوئی دستک دے رہا ہو۔ وہ مجھی کے کمرے میں گئی کہ اسے دروازہ کھولنے کو کے، لیکن وہ دہاں نہیں تھا۔ بولا نے سوچا کہ وہ شاید کچھ دیر کے لئے باہر نکلا ہو، اور غلطی سے دروازہ مغلل ہونے کے باعث باہر رہ گیا ہو۔ اس نے چراغ کو ہاتھ میں بلند کئے ہوئے سرعت سے دروازہ کھول دیا۔ وہ برآمدے میں کھڑا تھا رنجوانہ طور پر خلک کپڑوں کے ساتھ اور اندر آنے سے انکاری۔

”مجھے جانا ہے۔“ اس نے رندھی ہوئی آواز میں کھانتے ہوئے کہا۔

”اندر تو آؤ۔“ بولا نے الجا کی۔

”نہیں“ اس نے کہا: ”مجھے جانا ہے، جانے سے پہلے میں اس صرانی کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔“

”کیا حرفات ہے.....؟“ وہ بولی: ”بارش میں کیوں کھڑے ہو، اندر آ جاؤ۔“

”میں نے سوچا تھا کہ مجھے شکریہ ادا کئے بغیر نہیں جانا چاہئے۔“

بارش اور تیز ہوئی، دروازہ چرچرا لیا اور ہوا پچھاڑی۔

”زندگی نہیں ہے، پیاری ماں! شکریہ اور خدا حافظ۔“

وہ ہڑا اور بھاگ کھڑا ہوا۔

میں اسی وقت مدھم سی بکلی چکی اور بولا نے دیکھا کہ آگئن خالی تھا۔ وہ بو جھل ندموں سے لوٹ آئی اور بے چین نیند سو گئی۔ سونے سے پہلے وہ آپ سے آپ بڑا بائی کے اگلی صبح ایتوار کو یا بہتر ہے سموار کو ادائی صاحب سے ملتا چاہئے اور اسے یہ سب بتا دیا جائے، کیس یہ نہ ہو کہ مجھی کسی مصیبت میں جلتا ہوا۔ اسے توقع تھی کہ مجھی اس بات سے بہم نہیں ہو گا۔ وہ تو بہت اچھا بتا تھا۔

لیکن، ہوا یوں کہ ادائی صاحب ایتوار کی دوپر کو خود ہی آپنے، چپ چپ اور بجھے بجھے،

اس وقت بولا برآمدے میں ایک پرانے شوول پر بیٹھی آئی کی مینڈھیاں گوندھ رہی تھیں۔ اوائی صاحب بیٹھ گئے اور دور خلاؤں میں دیکھتے ہوئے بولا سے کہنے لگے: "خدای عطا کرتا ہے اور پھر اپنی امانتیں لوٹا لیتا ہے۔" کچھ ہی دری میں برآمدہ اور گھر کا صحن گاؤں کی قربیاً آدمی آبادی سے بھر چکا تھا۔

"لیکن میں آپ کو ہاتھی ہوں کہ ----- وہ جمع کے روز میں تھا اور انتوار کی صحیح گیا ہے۔" بولا نے کہا: "وہ جمع کے دن نہیں مر سکتا۔"

قبے سے بیٹھے کی موت کی خبر پانے اور بے ہوش رہنے کے بعد، بولا کی طبیعت ابھی کچھ ہی دری پسلے سنبھلی تھی۔ بیجی کی بیوی اور آئی کی ماں، موت کی یہ خبر اور مرنے والے کا بچا کچھا ترک ساتھ لئی آئی تھی۔ اس نے بتایا کہ بیجی جمع کی دوپھر اچانک مر گیا تھا اور بیٹھے کی شام سورج ڈوبنے سے پسلے اسے دنا بھی دیا گیا۔ وہ ضرور اسے دفاترے کو "کامنی" لاتے، اور اس نے بیشہ اس کی خواہش بھی کی تھی، لیکن وہ ہر وقت ایسا نہ کر سکے اور لاش ایک دن سے زیادہ وہ نہیں سکتی تھی۔

"وہ یہاں تھا۔ وہ یہاں تھا۔" بولا نے اپنی پیشانی ملنے اور روتے ہوئے کہا۔

"خاموش خاموش ----- وہ یہاں نہیں ہو سکا، گاؤں میں اسے کوئی تو دیکھتا۔"

"اس نے کما تھا کہ ہم کسی کو بھی اس کی خبر نہ کریں۔" بولا بولی۔

لوگ اپنے طور پر سکراتے اور اپنے سروں کو جھکا دیا۔ "بیچاری" کسی نے کہا: "صدے سے دماغ چل گیا ہے چاری کا۔"

"وہ جمع کے روز مرا ہے۔" بیجی کی بیوی نے دھرا دیا: "وہ اپنے دفتر میں تھا اور اس نے باہر دیکھنے اور چپڑا سی کو بلاںے کی خاطر کھڑکی کا پٹ اور انھالیا تھا۔ ایسے میں کھڑکی کا چوکھنا ثبوت گیا۔ کھڑکی نیچے آگری اور اس کی گردون توڑ کر رکھ دی، یہاں تک کے چوکھے کے تجز دھار کنارے نے تقریباً اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔"

"میرے ابو گلے میں اسکارف باندھے ہوئے تھے" آئی یکخت صحیح اٹھی۔

"چپ۔" ہجوم پکارا۔

بیجی کی بیوی نے گرباں میں ہاتھ ڈال کر ایک ٹلائی لاکٹ نکالا اور اور آئی کو چپ کرنے کی خاطر اس کے گلے میں ڈال دیا۔

”تمارے ابو نے بچھلے ہئے ہی“ یہ تمارے کرس کے ٹھنے کے طور پر بخواہا تھا۔ تم یہ ابھی سے پکن لو۔“

آئی اس سے کھلتے اور اچھاتے ہوئے دامن بائیں مھماتی رہی۔

"احتیاط سے بیٹا۔ یہ تمہارے باپ کا آخری تحفہ ہے۔" اداویٰ صاحب نے کہا۔

”میں یاد کر رہی تھی کہ، کیسے انہوں نے، ابھی کل ہی تو یہ کھونے کو دیا تھا۔“ آسی کہ اٹھنے۔

"نہیں، تم نے یقیناً یہ پسلے سمجھی نہیں دیکھا۔" سمجھی کی بیوی نے تھک مزاجی اور غصہ ملی سرائیں سکنی سے کما۔

پھر اس نے لاکٹ لے کر اسے کھولنا چاہیا۔

"لاو، بچھے دو۔" گاؤں کا سنار پکارا اور اس نے منزدھ کر اسے کھولنے کا کوشش کیا۔

آخر تھک ہار کرنے لگا: ”یہ یقیناً ناقص تم کا سونا ہے، اسے تو زنگ لگ چکا ہے۔ اسے کھولنے کے لئے تو اوزار جاؤ ہیں۔“

”ہاں اب مجھے یاد آگیا۔“ آسی بھینے کے غمربے ہوئے سایت لمحے میں پولی۔

دھیرے دھیرے چوگرد لوگوں کا بجوم اکھتا ہوتا گیا اور غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی شہری

کرنوں میں سونا دمکتا رہا۔

سنار نے لاکٹ آسی کو لوٹاتے ہوئے اپنی سرگوشی میں کہا: ”بتابا، اس نے کیسے کھولا تھا

”ہائے بے چارے کی گردن۔“ بولا نیم وخت میں پکارا تھی: ”ای لئے تو اتنے لزیز
کھانے نہیں کھاسکا، جو میں نے اس کے لئے پکائے تھے۔“

ادائی صاحب نے اعلان کیا کہ شام کی عبادت کے بعد مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کی جائے گی۔ جھوم منتشر ہو گیا۔

موسیٰ جادوگر، آخر میں جانے والوں میں سے ایک تھا۔ وہ اب بہت بوڑھا تھا اور خم کھا

گیا تھا۔ سب جانتے تھے کہ جب کبھی کوئی آفت پڑی تو موئی سے مشورہ کرنے پر ادائی صاحب بھی مسترض نہ ہوتے تھے۔

موئی مزید جنکا اور بولا کے کان میں بدبد لایا: "تمیں ایکس سال پلے ہی، جب وہ چھٹی بار گیا تھا تو اس کی ہڈیاں توڑ مردی رکھا چاہئے تھیں، اگر وہ اس تمام مدت میں خود کو زندہ ظاہر کر کے تمہارا مذاق نہ ادا تا۔ کیا میں نے نہیں کہا تھا؟ پر عورت ذات بہت خود سر اور ضدی ہوتی ہے۔"

"بولا، اپنے سیاہی مائل چہرے کے ساتھ انھ کھڑی ہوئی، اس کی آنکھوں میں متنا کا غصہ اور خود رجھک رہا تھا۔

"میں خوش ہوں کہ میں نے یہ سب نہیں کیا۔" وہ بولی ----- "اور یہی وجہ ہے کہ وہ بیشہ کے لئے چلے جانے سے پلے میرا شکریہ ادا کرنے آیا۔"

اس نے آسی کو اپنے ساتھ چھتا کر بھیجن لیا۔ اور کہا: "مجھے فخر ہے کہ میں نے اسے دینا میں پہنچنے کا ایک موقع دیا، اس لئے کہ زندگی بہت حسین ہے۔ مجھے پتا ہے، تم میری اس بات کو نہیں سمجھ سکتے کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔ آخر کار تم ایک مردی تو ہو۔"



ارنسٹ ہنگنگوے: تعارفیہ

نوبل انعام یافتہ فرانسی طراز اور ناول نکار، ارنست ہنگنگوے ۲۱ - جولائی ۱۸۹۹ء
ایلینیاٹ، نارتھ اورک پارک ایونیو، شکاگو، امریکہ میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ کلیرنس
ایڈمنڈز ہنگنگوے، ڈاکٹر آف میڈس سن ہونے کے باوجود پیشے کے اعتبار سے ایک رہنمائی
معاون تھا۔ کچھ بھی سبب ہے کہ ان کا گراند متوسط درجے سے کبھی اورپ نہ اٹھ سکا۔
والدہ کا نام گریس ہال تھا۔ جو اس دسات میں موسیقی کی تعلیم دیا کرتی تھی۔

ارنسٹ ہنگنگوے کی دلچسپیاں اپنے خاندان کے دیگر افراد سے بھی مختلف رہیں۔ وہ
ایک مم جو، کھلنڈر اور لا ابالی نوجوان تھا۔ جس کا لڑکا اپنے گھر کے قریب، کلے
آسمان تئے ایک جھیل کے کنارے، چھوٹے سے نیچے میں گزارا۔ وہ پرسوں بندوق اخھائے
جنگل میں شکار ڈھونڈتا پھرا یا اپنی سخنی سے کشتی پر بڑی مچھلیوں کے تعاقب میں سرگردان
رہا۔ تاہم اس کی دو ابتدائی کمابیاں ۱۹۱۶ء کے اوک پارک پیلک سکول کے میگزین میں
شائع ہوئیں۔

یہ جنگ عظیم اول کا زمانہ تھا۔ ۱۹۱۴ء میں ہنگنگوے نے تعلیم کو خیر باد کہ کر پہ
طور پاہی جنگ میں شرکت کرنا چاہی، لیکن نظر کمزور ہونے کے سبب ایسا نہ کر سکا اور
محصوراً اپنے چپا کے پاس کنسس نھل ہو گیا۔ وہیں اس نے صحافت کی تربیت حاصل کی
اور کنسس شی اخبار میں بطور صحافی، جنگ کی صورت حال پر تجزیے لکھنے لکھنے اچانک
ایک روز اعزازی لیٹئریٹ اور ایسپرنس ڈرائیور کے فوج میں بھرتی ہو گیا۔

ان دونوں اس کی مم جوئی عروج پر تھی اور وہ کسی طور فرنٹ لائن پر جانا چاہتا
تھا۔ پھر اس کے حقیم اصرار پر اسے فرنٹ لائن تک جانے کی اجازت مل گئی۔ اب وہ

ساعل پر سوار ہو کر پاروو کے دھنڈکوں میں فوجیوں کو رسد پہنچانے لگا۔ ناول ۱۹۱۸ء میں جن کے ایک برس نے اس کے گھنٹے کو تجید ڈالا۔ ریڈ کراس ہسپتال میں علاج کے دوران اس کی طاقت ایگنیز (AGNES) تاں ایک نر سے ہوئی۔ کچھ دن کے لئے دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے، لیکن ایگنیز نے اس سے بے وفاکی کی اور ایک اطالوی نوجوان کو اپنا شریک حیات چن لیا۔ اس ناکام محبت کی یادگار اس کا ناول "ہتھیاروں کو الوداع" (A FARWELL TO ARMS) ہے۔ اب وہ تھا اور اداس تھا۔ ۱۹۱۹ء میں اس نے افسانہ نگاری کا آغاز کیا اور محبت میں ناکامی کا سونہ پھیرنے کی خاطر ۲۳۔ دسمبر ۱۹۲۱ء میں الزتح ہیڈلے رچرڈن سے شادی کر لی، نے ناکام ہی کہتا چاہئے۔ اس لئے کہ ۱۹۲۶ء میں دونوں میں عیحدگی ہو گئی۔ اسوقت تک اس کا پہلا افسانوی مجموعہ "ہمارے وقت میں" (1925) شائع ہو چکا تھا۔ ۱۹۲۲ میں وہ برس، فرانس چلا گیا، جہاں وققے وققے سے اس کی ملاقائیں ایزرا پاؤلز، جیمز جوائس، سنکلیر لوئیس اور گری جیزالد سے ہوئیں۔ اس کا پہلا ناول "سورج بھی طوع ہوتا ہے" (THE SUN ALSO RISES) اور "فایستا" (FIESTA) ۱۹۲۶ء میں سامنے آئے۔ اگلے برس اس کا افسانوی مجموعہ "عورت کے بغیر مرد" (MEN WITHOUT WOMEN) دوسری شادی پاؤلین نیز تاہمی خاتون سے ہوئی۔

اس کے پاؤں میں چکر تھا اور اس کی ملکوں مزاجی اسے ایک پل بھی جین سے بینختے نہ دیتی تھی ۱۹۲۸ء تا ۱۹۳۶ء کا زمانہ اس نے قلوویڈا میں گزارا۔ اس زمانے میں اس کا ناول

"ہتھیاروں کو الوداع" (A FARWELL TO ARMS)

اور افسانوں کے تین مجموعے

(1933) "WINNER TAKE NOTHING"

"افرقہ کی ہری بھری پاڑیاں" (GREEN HILLS OF AFRICA) ۱۹۳۵ء

اور "بعد دوپر کی موت" (DEATH IN THE AFTERNOON) ۱۹۳۶ء شائع

وہ ایک ایسا شاہ پرست تھا جو افریقہ اور مشرق بحیرہ کے سندروں اور جنگلوں میں دور تھک گیا۔

دوسری جنگ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) کے دوران ایک میجرین کے نمائھے کے طور پر اس نے دھوکیں کے باطل پھائکئے، اجمن میں مل نائیجٹ کی اور دہاں کی خانہ جنگی کی رپورٹنگ امریکی اخبارات میں کرتا رہا۔ اس دوران میں اس کی متعدد کتابیں شائع ہوئیں۔

تالیل "اہل ثروت اور ندار" TO HAVE AND HAVE NOT (۱۹۳۷ء)
ڈراما "THE FIFTH COLUMN" (۱۹۳۸ء)

تعمیدی مضمائن "THE HEAT AND THE COLD" (۱۹۳۸ء)
تولی "FOR WHOME THE BELL TOLLS" (۱۹۳۰ء)۔

۳۔ نومبر ۱۹۳۰ء میں اس نے اپنی دوسری بیوی پاؤلین کو طلاق دیدی اور ۲۰۔ نومبر ۱۹۳۰ء کو مارتا گلمسارن سے شادی کر کے ہنی مون مٹانے تو یارک روائہ ہو گیا۔ میکسیکو سے واپسی پر مارتا گلمسارن کے ہمراہ ہوانا میں منعقد ہونے والی دانشوروں کی ایک ایسی تھیم میں شریک ہوا، جو فتحم کالست تحریک کے اثر کو زائل کرنے کے لئے بنائی گئی تھی۔ نومبر ۱۹۳۲ میں اس کی تیسرا شادی بھی ناکام ہو گئی۔ یوں اس نے مارتا کو طلاق دے کر امریکی ریاست میں سونا کی ایک خاتون میری والش سے چوتھی شادی کر لی۔ ان دونوں کی آخر تک بھی۔

جنگ عظیم دوم کے خاتمے پر اس کی زندگی میں قدرے نہ صراحتاً آگیا۔ اب وہ کیبا میں قیام پذیر۔ تھا اس کی دلچسپیاں پھلی کے شکار اور لکھنے لکھانے تک محمود تھس کر فیدرل کاسترو نے کیبا کی عطاں باقدار سنبھالی۔ یہ تبدیلی ہمکنگے کے لئے قابل قبول نہ تھی، اس نے امریکا پلت آیا۔ اب اس کے انسانوں کا مجموعہ "وریا" کے پار اور درختوں کے پیچے ACROSS THE RIVER AND INTO THE TREES (۱۹۵۰ء)
تالیل "بڑھا اور سندھر" THE OLD MAN AND THE SEA (۱۹۵۲ء) انسانوں کا

مجموعہ

"کلمنجارو کی برنس" THE SNOWS OF KILIMANJARO

اور "میکبار کی مختصر خوشی"

THE SHORT HAPPY LIFE OF MACOMBER

شائع ہوئے۔ اس کی آخری تصنیف "MOVEABLE FEAST" تھی جو اس کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔

1952ء میں اسے "آرڈر آف کارلوس" کا اعزاز طا اور نوبل انعام بھی۔ لیکن اس کی صحت تجزی سے گر رہی تھی۔ 1960ء کے آخری میتوں میں نہنگوے پر زیاد بیٹس کا مسلک حملہ ہوا اور 1961ء کے ابتدائی چند ماہ اس نے ایک فنیاتی معالج کی زیر مگرانی سے کلینک میں گزارے۔ آخری دنوں میں ہوانا (کوبہ) سے نو میل دور ایک پہاڑی چوٹی پر، جنگ عظیم اول کی فرنٹ لائن کے نتے سائل سوار، افریقہ کے جنگلوں کے ماہر شکاری اور مل قائم کو اتنا درجہ کی غاہت کا سامنا تھا۔ 2 جولائی 1961ء کی صبح اپنے گمراہی سیڑھیاں اترتے ہوئے وہ اپنے وجود کو نہ سار سکا اور گرا۔ اس وقت تک وہ تین بار مومنوں کے عجین حادثات کا شکار ہو چکا تھا۔ بارہ مرتبہ مختلف حادثات میں اس کے دماغ کو صدمہ پہنچ چکا تھا۔ ایک بار اس کی کھوپڑی ثوٹ پھلی تھی۔ افریقہ کے جنگلوں میں وہ دوبار ہوائی حادثوں کا سامنا کر چکا تھا۔ جنگ کے دوران اسے نو بار گولیوں کا نشانہ بننا پڑا۔ بم کا گولہ پہنچنے سے اس کا جسم لگ بجگ ازھائی سو فولادی لکھوں سے چھلتی ہوا۔ یہ سب کچھ اس نے سامنا کیا۔

ایک لمحہ کے لئے اس کی چشم قصور میں وہ سارے منافر گھوم گئے، جب موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے، وہ زندگی کے ہر کھیل کا ہیرو تھا، اور اب بے بی کا یہ عالم ————— اس نے سچا۔ پھر ہمت کر کے اٹھا۔ اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی میری والش گمراہ نیند سر رہی ہے۔ اب وہ قدم بجا کر رکھتے ہوئے تہ خانہ کی سیڑھیاں اڑ گیا۔ تہ خانے میں اس کا اسلہ خانہ تھا۔ اس نے اپنی دونالی بندوق میں دو کارتوں بھرے۔ پھر ایک زور کا دھاکہ ہوا اور جب میری والش گمراہی ہوئی تہ خانے تک پہنچی ہے تو اس نے دیکھا کہ نہنگوے کے سر سے خون رس رہا تھا اور وہ ابدی نیند سوز رہا تھا۔

ساری دنیا سے تعریت کے ہزاروں تاز آئے لیکن سن ولی کے مقام پر نہنگوے

لے جاۓ میں چد لوگ تھے۔

ہمگوئے کا بیٹا جارج - ایچ - ہمگوئے لکھتا ہے:

”جب پاپا کو زمیں میں اترنے لگے، تب مجھے یقین آیا کہ ہستا اور قصہ نگاہ کا ہوا
ہمگوئے اب بیشہ کے لئے خاموش ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ ”بھی کبھار پاگل
پن، موت سے بھی زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے۔“ شاید پاپا بھی اس نتیجہ پر پہنچے ہوں۔ اپنی
ہی بندوق کی لبی، اپنے لئے استعمال کرنے سے پہلے انہوں نے سوچا تو ہو گا کہ پرندہ
اڑتے ہوئے گولی کا نشانہ کیسے بنتا ہے۔“

مرزا حامد بیگ

ارٹ ہنگے، مرزا حمدیگ

بارش میں بلی

وہ اس کی ناگلوں پر چاک برساتے تھے۔ اور سفید گھوڑا الف ہو جاتا تھا۔
سوار نے رگابوں کو سما کر سیدھا کرتے ہوئے اخالیا اور کاشمی میں اڈس لیا۔
جب گھوڑا دلی چال چلا تو اس کی پچھلی ناگلوں کے پیچے لگی ہوتی بھری بھری نسلی
حیلی آگے پیچے جو لئے گی۔ اخالیے کے چھوکرے اس کی پچھلی ناگلوں پر مسلسل چھڑواں
پرسا رہے تھے۔

پھر وہ تن کر کھڑا ہو گیا۔ ایک چھوکرے نے اس کی لگام تھامی اور سکھنچا ہو آگے
لے گیا۔ سوار نے ایڑ لگائی، آگے جھکا اور خونخوار بتل کے سامنے اپنا نیزہ لبریا۔ گھوڑے
کی اگلی ناگلوں کے درمیان سے خون جاری تھا۔ وہ پریشان حال ڈگکا رہا تھا اور بتل پر
حملہ کرنے کے لئے کسی طور آمادہ نہ ہوتا تھا۔
ہوٹل میں صرف دو ہی امریکی باشندے غیرے ہوئے تھے۔

کرے سے لے کر یہ چھوپوں کے راستے تک ان کی کسی سے شناسائی نہ تھی۔
دوسری منزل پر ان کا کمرہ سمندر کے رخ پر تھا۔ اس کے سامنے باغ عامدہ اور
جگ کی یادگار نصب تھی۔ باغ میں اوپنجے تاز کے درخت اور ہرے رنگ کی نشتنی
تھیں۔ خونخوار موسم میں وہاں اکثر ایک نہ ایک مصور اپنی ایزل کے ساتھ نظر آتا۔
تصوروں کو تاز کے درمیانی راستے اور سمندر کے رخ پر، باغ کے سامنے
استادہ ہوٹل کے نکرے ہوئے رنگ پسند تھے۔
اخالوی باشندے دور دراز سے جگ کی اس یادگار کو دیکھنے آتے۔ کافی سے فی
ہوتی یہ یادگار بارش میں لکھتی تھی۔

ہارش ہو رہی تھی۔

ہارش کے قدر تاز کے درختوں سے ہوتے ہوئے بچے گر رہے تھے، پھرلی روشنوں کے گڑھوں میں پانی فھر گیا تھا۔

ہارش میں سندھ کی لمبی ایک لمبی لکھر بنا کر ساحل سے کھراتی تھیں اور ایک بار پھر لکھر کی صورت، ساحل تک آنے کے لئے واپس ہو جاتی تھیں۔ جنکی یادگار کے قریب چورستے میں کھڑی ہوئی موڑیں اب عائیب ہو چکی تھیں۔

چوک کے اس پار کینے میں کھڑا ہوا ایک بیڑا، دریاں چورستے کو دیکھ رہا تھا۔

امریکن کی بیوی کھڑکی کے پاس کھڑی باہر کا نظارہ کر رہی تھی۔ باہر میں ان کی کھڑکی کے بچے ایک ملی، دہری ہو کر بچتی ہوئی ہرے رنگ کی میز تے دیکی ہوئی تھی۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ سٹ کر جانکنے سے بچ جائے۔
”میں بچے جا کر اس ملی کو لاتی ہوں۔“ لوکی نے کہا۔

”میں چلا جاتا ہوں۔“ خاوند نے بزر پر لیٹئے اپنی خدمات پیش کیں۔

”نہیں“ میں لے آؤں گی۔ بے چاری پانی سے بچے کے لئے میز تے بیٹھی ہے۔ خاوند نے مطالعہ جاری رکھا۔ وہ دو ٹکیوں کا سارا نئے پالٹتی کی طرف لیٹا تھا۔
”بھیگ نہ جانا۔“ اس نے کہا۔

اس کی بیوی سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔ جب وہ استقبال کے قریب سے گزری تو ہوٹل کا مالک اٹھ کھڑا ہوا اور اس کی جانب احرام سے جھکا، اس کی نشست کر کے دوسرے سرے پر تھی۔ وہ بہت اوپھے قد کا آدمی تھا۔

”مزاج شریف؟“ لوکی نے کہا۔ وہ اسے اچھا لگتا تھا۔

”ما۔ ما۔ مادام مردانی۔ بہت خراب موہوم ہے۔“

وہ میز کے پیچے کھڑا تھا، جو شم روشن کر کے کونے میں تھی۔ وہ اسے اچھا لگا تھا۔ خاص طور پر اس کی انتبا کی سمجھی گی۔ جب وہ شکایات سنتا تھا، اسے وہ انداز پسند تھا، جب وہ کسی قسم کی خدمت بجا لاتا تھا۔ ہوٹل کا مالک ہونے کے بیٹتے اس کے احساسات کی وہ قدر دان تھی، وہ اس کے بوڑھے، بھاری چرے اور بڑے بڑے ہاتھوں کو پسند کرتی تھی۔

مبت میں سرشار، اس نے دروازہ کھولا اور باہر دیکھا۔ اب بارش اور تیز ہو گئی۔ ایک آدمی رپڑ کی برساتی اوڑھے سنان چورا ہے سے ہو کر کینے کی جانب آ رہا تھا۔ ملی داہنی طرف ہو گئی، شاید وہ ججھے کے نیچے سے ہوتی ہوئی گزر سکے۔ اس نے سوچا، وہ دروازے میں کھڑی ہی تھی کہ ایک چھتری اس کے عین پیچھے کھلی۔ یہ وہی خادم تھی، جو ان کے کمرے کی دیکھ بھال کیا کرتی تھی۔ ”بارش میں بھیگ نہ جائیے گا۔“ وہ اٹالاوی زبان بولتے ہوئے مکرائی۔ یقیناً اسے ہوٹل کے مالک نے ہی بھیجا ہو گا۔

خادم کے ساتھ، جس نے چھتری تھام رکھی تھی۔ وہ سکرپروں سے نی ہوئی روشن پر چلتی رہی۔ تاؤ فیکنگ اپنی کھڑکی کے ستلے نہ ہنچ گئی۔ بیز دیہیں رکھی تھی۔ بارش سے دھلی، نکھری ہوئی بزر میز، لیکن لمبی جا پھلی تھی۔ اسے شدید مایوسی ہوئی۔

خادم نے اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا بات ہے مادام؟“

”یہاں ایک لمبی تھی۔“ امریکی لڑکی نے جواب دیا۔

”لمبی.....؟“

”ہاں ----- ایک لمبی۔“

”لمبی۔“ ملازمہ ہنس دی۔

”بارش میں گھری ہوئی لمبی۔“

”تھی“ اس نے کہا۔

”میز کے نیچے تھی، پھر، اوہ ----- وہ مجھے چاہئے تھی، مجھے چاہئے تھی۔“

وہ جب انگریزی میں بات کرتی تو خادم کا چوڑہ بیٹھ جاتا۔

”آئیے مادام.....!“ وہ بولی۔ ”ہمیں اب اندر جانا چاہئے۔ آپ بھیگ جائیں گی۔“

”واقعی“ امریکی لڑکی نے جواب میں کہا۔

وہ سکرپروں والا راستہ طے کرتی، دروازے میں سے گزر گئیں۔ خادم چھتری سینئے کی خاطر باہر ہی رک گئی۔ جب وہ استقبالیہ کے سامنے سے گزری تو ہوٹل کا اٹالاوی مالک اپنی نشت سے جھکا، لڑکی کو اندر ہی اندر کوئی بست چھوٹی لیکن تھی ہوئی کوئی کچھ محسوس ہوئی۔

ہوئی والے نے اسے احساس دلایا کہ وہ بہت سُختی سی، لیکن ساتھ ہی بتاہم ہے۔ اسے لمحائی طور پر انہا آپ انتہائی اہم محسوس ہوا۔

وہ سیڑھیاں چڑھ گئی۔ اس نے دروازہ واکیا۔ جارج بستر پر اسی طرح مطالعہ کر

- ۱۷ -

"لیلِ ملِ مجنی...؟" اس نے کتاب رکھتے ہوئے پوچھا۔

”وہ جا بھی تھی۔“

"حیرت ہے، کہاں چلی گئی۔؟" اس نے آنکھوں کو آرام دیتے ہوئے پوچھا۔ وہ

بزرگ پیغمبر

”کتنی خواہش تھی مجھے اس کی۔“ اس نے کہا۔

”میں خود نہیں جانتی۔ میں نے ایسا کیوں چاہا۔ میں اس بے چاری کو لانا چاہتی

تمہارے ملک کے لئے پاہر بارش میں ہونا کوئی مذاق نہیں ہے۔“

خارج پھر کتاب بڑھنے لگا۔

وہ اٹھ کر چلتی ہوئی سگھار نیز کے آئینے کے سامنے بیٹھ گئی۔ وہ دستی آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ رہی تھی۔

اس نے اپنے چہرے کے خلوط کا مطالعہ کیا، پسلے ایک طرف سے پھر دوسری طرف سے، پھر اس نے اپنے سر کی پشت اور گردن کا جائزہ لیا۔

“کیا خالی ہے، یہ اچھی بات نہ ہوگی کہ میں اپنے بالوں کو بڑھتے دوں...؟”

ایک بار پھر ————— اپنے خدو خال کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے کہا۔ جارج نے ٹھاں اٹھائیں اور اس کی گردن کے پچھلے حصے پر نظر کی۔ بال ٹوکوں کی طرح کئے تھے۔

"میں اسی طرح پسند کرتا ہوں، جیسے اب ہیں۔"

”میں ان سے آتا گئی ہوں۔“ وہ بولی۔ ”میں لڑکوں کی سی چحب سے آتا گئی ہوں۔“

خارج نے بستر کر دی۔

جس سے لوگوں نے پولنا شروع کیا تھا، چارج کی نظرس اسی پر جی ہوئی تھیں۔

"تم خوبصورت دکھائی دیتی ہو۔ بہت عمدہ۔" وہ بولا۔

اس نے آئینہ سکھار میز پر رکھا اور کھڑکی کی طرف گئی۔ باہر نگاہ کی۔ اب انہیمرا بڑھ رہا تھا۔

”میں چاہتی ہوں کہ اپنے ہال خوب کس کر پیچھے کی طرف ہموار کروں۔ اور پشت پر ایک بڑا سا جوزا بناوں، جسے میں محسوس بھی کر سکوں۔“ وہ بولی۔

”میں چاہتی ہوں کہ ایک ملی ہو، جو میرے زانو پر پیٹھے اور جب میں اسے سلاواں تو وہ آہست آہست، خر، خر، بولے۔“
”ہوں۔“ بہتر میں سے جارج نے ہواب دیا۔

”اور————— میں چاہتی ہوں کہ میز پر اپنے چاندی کے چھمری کاٹنے سے کھانا کھاؤں، اور مجھے موسم بیان چائیں، اور میں چاہتی ہوں کہ بazaar کا موسم ہو، اور میں آئینے کے سامنے بالوں میں سکھی کروں————— اور ایک ملی چاہئے اور کچھ نئے کپڑے۔“

”اوہ————— بس کرو۔ اور پڑھنے کے لئے کوئی چیز لے لو۔“ جارج بولا۔ وہ پھر پڑھنے میں جث گیا تھا۔

اس کی بیوی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ اب تک انہیمرا چما چکا تھا اور ابھی تک تاز کے درختوں میں بارش ہو رہی تھی۔
”بہرحال، مجھے ایک ملی تو چاہئے“ وہ بولی۔ ”مجھے ایک ملی چاہئے اور ابھی چاہئے، اگر میرے ہال لبے نہیں ہیں، یا کوئی دلچسپی نہیں ہے، تو ملی تو لے ہی سکتی ہوں۔“

جارج سنی ان سنی کر رہا تھا۔ وہ اپنی کتاب پڑھ رہا تھا۔

لوکی نے کھڑکی میں سے اس طرف دیکھا جماں چورستے میں روشنی ہو گئی تھی۔
کسی نے دروازے پر دستک دی۔

”چلے آؤ۔“ جارج پکارا۔

اس نے کتاب سے نظر س اٹھا کر دیکھا۔ دروازے پر خادمہ کھڑکی تھی۔ وہ کچھے کی پشت جیسی رنگت کی بست بڑی ملی تھائے ہوئے تھی، جو بختی سے اس کے ساتھ چمنی ہوئی، آدمی نیچے لٹک رہی تھی۔

”محاف سمجھے.....! ماں نے مجھ سے کہا ہے کہ یہ مادام تک پہنچا دوں۔“

عالم شاہ خان: تعارفیہ

ڈاکٹر عالم شاہ خان اودے پور یونیورسٹی، راجستان (بھارت) میں ہندی زبان و ادب کے استاد ہیں۔ خان صاحب نے اپنے پی اچ۔ ڈی۔ کے تحقیقی مقالہ میں ہندوستانی تہذیب و تمدن کے اہم موضوع پر تخصصی نویسی کا کام کیا۔ اسی موضوع پر ان کی ایک کتاب مدت ہوئی، شائع ہو چکی ہے۔

ہندی کمائی کاروں میں عالم شاہ خان کا نام بہت نمایاں ہے۔ ان کے انسانوں خصوصاً "ایک اور سیتا" (ساریکا جولائی ۱۹۶۴ء) "مراووں بھرا دن" (ساریکا - عالی طوائف نمبر: چنوری ۲۷۱۹۶۷ء) "ندا کی ارجمندی" (ساریکا: ستمبر ۱۹۶۷ء) اور "کرائے کی کوکھ" (ساریکا جون ۱۹۶۷ء) کو ہندی کے نئے افسانوی ادب میں اہم کارناموں کا تسلیم کیا چاہئے۔ افسانہ "ایک اور سیتا" کے مظہر عام پر آئے کے بعد عالم شاہ خان کا شاعر ہندی کے متازعہ کمائی کار کے طور پر ہونے لگا تھا۔ افسانہ "کرائے کی کوکھ" کی اشاعت کے بعد ہندو تہذیب کے خدائی فوجداروں نے انہیں "مسلم مذہبی ہازیگر" اور "ہندوستانی معاشرہ کا کھلا باغی" قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر عالم شاہ خان کا خصوصی موضوع راجستان میں اودے پور "بیکانہر" جسے پور، الور اور جودھ پور کی گردی پڑی آبادیاں اور وہ "کچلی ہوئی آوازیں" ہیں جو راجستان کے لق و دلق صحراؤں میں اسارے ہوئے جھونپڑوں سے اٹھتی تو ہیں، لیکن قبولت کا شرف حاصل نہ کر پانے والی دعاوں کی طرح، کہیں راہ میں ہی دم توڑ جاتی ہیں۔

عالم شاہ کی کمائیوں میں رانا پرتاب اور اکبر اعظم کے فیصلہ کن معرکہ (بلدی گھانی کی جگ) کے بعد "راجپوت خانہ بدوش خانص" اہمیت کے حامل ہیں، جبکہ ان کے مخصوص ہندی اسلوب میں ویدک سترکرت، مختلف النوع بجاشاوں اور پراکرتوں کے بعد اجھرنش، کھڑی بولی اور ہندی ناگری کی باہمی آویزش خصوصی توجہ کی طالب ہے۔

مرزا حامد بیگ

عالم شاہ خان، مرزا حامد بیگ

کرانے کی کوکھ

”مگنے—— بونے جائی پہ بیج، اگائی جا لوڈے، سیٹ فصل بیٹوں کی،
دونوں ہاتھ۔“

جتنا کیوں ہے، آگوan—— یہ سکھرا مگلے پڑ گیا، گھبرا گیا میں تو—— سال
لگائی ہے کہ لو؟ ٹھی اور لے ٹھی بیج۔ سال کے سال لوڈا لے لو۔ ٹھن بھر دا، ہر جا
چھوکرے ہی چھوکرے۔“

”شتر کر شتر—— یہاں تو ترس گئے لڑکے کی صورت کو۔ لڑکیاں ہی
لڑکیاں۔ اڑانے کے دن ختم ہو گئے، کنے ڈھیلے پڑ گئے، بیٹے کی آس میں آنکھیں پتھرا
ٹھیکیں۔ پر نصیب اپنے اپنے۔“

”ارے—— مرا کیوں جاتا ہے، کر لے بدلتے سے بیٹی کا۔ میں تو بیٹوں
کے بہاؤ میں ذوب مرا—— بیٹے، کم نصیب۔“

”وکیھ، سکرنا جانا۔—— دیگا بیٹی کے بدلتے بیٹا؟“

”چل، ابھی لے۔ جونہ بدلتے اپنے باپ کا نہیں۔“

”جانے بھی دے۔ بیٹے بیٹی کا ناتا یوں نہیں بنتا۔ رشتہ وہ جو خون کا۔ تمھی تو
متا کرتاتی ہے، دل نہیں نہرتا۔—— لیکن یار عجب ہے۔ کبوتری، پایا اندھا گرا کر پچ
جنے۔ کاش، بندے بیٹی آدموں نیں ایسا ہوتا، تو میں تھوڑے سے۔—— تمیری جورو سے
بھیک مانگتا۔“

”وہ کیا بھلا.....؟“

”سدا کے ذات بھائی ہو۔ میرے اندر سے تم پچھے نکال“ وہ پر
آدمی کا اندھا ہو، تب نا۔ کچھ کوں بھی تو کیسے...؟“

”آدمی کا اندھا...؟ باولا ہو گیا ہے کیا؟ پھر بھی کہ، جو ہو گا کروں گا۔“

”تو من... ہوتی آئی کوں۔ پر کھون کی رہت بھی ہے۔۔۔ چھوڑ کیوں
نہیں دلتا، تو اپنی جورو کو میرے ساتھ۔ وہ ایک برس میرے ساتھ رہ لے گی۔ بس بینا بھر
لے لوں، اس کی کوکھ سے۔۔۔ پھر جھڑا عوضانہ جو بنے لے لے۔“

”پوں کو۔۔۔ چار پیسے جڑ گئے تو اپنے لگوٹیا یار کی لگائی کو تاکے لگا۔“

”آنکھیں جوڑتے، دل والئے کی بات نہیں۔ بس چاہتا ہوں کہ گھر کا اجالا جڑ
جائے۔ سانجھے کے کھیت ہم نہیں جوتے کیا...؟ بیٹائی، بوارا بھی تو ہوتا ہی ہے تا۔ پھر اپنی
ذات برادری میں تو ایسا ہوتا ہی آیا ہے۔۔۔“

”لے سلگا“ کہتے ہوئے آگیوں نے بیڑی آگے بڑھا دی اور ”ٹھک“ کر کے دارو
کی بوقلم کوئیں کی مینڈھ پر رکھ دی۔

ہتھیلیوں میں مل دے کر رہی کے مرے کو سنجاتے، اور بیڑی کو دانتوں تلے دبا
کر سلتنی دوا سلائی کو باخون کی اوٹ میں کر کے گھنوا اپنے ہوننوں تک لے آیا تو چرے
پر بے ترتیب داڑھی کے بالوں تلے، باہم ابھی اور بکھری ہوئی جھزوں کا جال ابھر آیا۔
اس نے زور کا دم لگایا اور بولنا:

”لے آگیوں یاد۔۔۔ تو بات پر بات خوب مارے۔۔۔ وہ تمہی
گھر والی؟“

”چل، تو اسے اپنے گھر میں ڈال لے۔ تمرا کیا جائے، کر لے بدلا۔ میری دوسری
سے اپنی کا۔ کو، کچھ اور بھی دوں؟“

آگیوں نے مومنہ تک آئی بوقلم سے ایک گھونٹ لے کر کما، اور بوقلم گھنوا کی
نھری ہوئی ہتھیلی پر نیک دی۔ اب دونوں کی آنکھوں میں سرخ دورے جھلکنے لگے تھے۔
برگد کے گھنے چپوں کی چھنثار سے چھنتا ہوا چاند، چاروں اور چھلی تاریکی کو
دھکیل کر ان دونوں کے قرب و جوار میں چھلے گدے لے پانی میں جھانک رہا تھا۔ ایسے میں
آگیوں نے کھنکار کر تھوکا تو پانی میں ایک پھوزا سا تیرنے لگا۔

"بول منکور ہے....؟ ارے سوچ، بورو کے بدالے جورو اور اوپر سے نوٹ۔ اسے کہن جوتی کے بدالے جوتی اور اوپر سے چاندی کی سخت۔۔۔۔۔ دوچی کی گاتھے بھی ڈھیل نہیں، پر بینا نہیں ہے اس کے مقدر میں۔۔۔۔۔ میں لایا ہی اسے بیٹھے کے لئے تھا۔ چھوڑ یہ سب اور بئور ثواب۔"

"لیکن میری گھر والی۔۔۔۔۔ اس سے بھی تو۔۔۔۔۔"

"اب بات کی تماں توڑ بھی کہیں پر۔۔۔۔۔ وہ عورت ذات۔۔۔۔۔ سر کا سائیں جو کرے، وہ اس کا دین دھرم۔"

"زرا سوچ بچار کر لوں۔" سکتو انے دارو سے تر ہونٹوں کو کرتے کے تھے سے

پوچھتے ہوئے ہنکارا بھرا۔

"لگانے کا سودا ہو تو سوچ بھی۔۔۔۔۔ بولتا نہیں؟ جی کرے تو برس دو برس بعد پھیر لینا۔ یہی جان کہ میرا بچ رکھنے کو، پھونٹنے تک تو نے اپنا برتن مجھے سونپا اور میں نے تجھے۔"

"تو جان۔۔۔۔۔ ساری برادری تجھے "سرخ" کے، اور تو گھر والی کو برتن بولے۔ وہ بے چاری خود کو کچھ نہ جانے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ یہوی ڈھور ڈھگر ہے؟ اس کھوئنے سے اس کھوئنے پاندھ دو؟"

"جیسے باپو گاندھی فر فر بولے، دیے بولتا ہے۔ ارے نادان، کل تمہی میری پاکدا من، گپڑی میں دھول جھوک کر اپنے سر کی دو کھنڈی خویلی الائچہ جاوے۔ تو ہی چا۔۔۔۔۔ کیا ہم دونوں اس کے لیکھ کا لا پکڑ لیوں گے؟ کیا ہوتا نہیں ایسا؟ اپنی ذات برادری میں جھکڑا نہیا اور بات آئی گئی ہو گئی۔"

"ارے مجھے سب پتا ہے، لیکن۔۔۔۔۔ یہ بچے کچے۔۔۔۔۔ ہیں تو سب بچے۔"

"لیکن دیکن کچھ نہیں۔۔۔۔۔ اس کنبے اور بال بچوں کی پال پوس کے لئے اور لے لے۔۔۔۔۔ مجھے بینا چاہئے، اور میں جانتا ہوں کہ تمہری کے جو ہو گا، وہ بینا ہی ہو گا۔۔۔۔۔ آج تک اس مرد صفت نے بیٹی جنی بھی تو نہیں۔۔۔۔۔ کتنے ہوئے اس کے؟"

"مجھ سے تو تمیں ہیں۔ پسلے دو اور ہیں۔ اگلے آدمی سے۔"

"ساتھ نہیں اٹھا لایا، پسلوں کو"

”پر ایا موت گھر لا ڈالوں....؟ ان کا بھیرا الگ۔“

”جل-----دو جانوں پر، سو اور لے مجھ سے، اور چھوڑ گھروالی کو۔“

”سو الگ بھرے تھے، میں نے ان چھوکروں کے، پورے سو۔“

”مگنے...! بھاگ دوڑ میں بھی حساب کتاب سے نہیں چوکا-----پر تب اس کی کاغذی بھی تو محشری ہوئی تھی۔ جوین تو سب چاٹ چکا اس کا-----جل، نیز
تمن سو پر۔“

”وزرا اپنی گھروالی سے بھی تو کہہ سن لوں۔ تو بھی اپنی ست پھیری سے ما تھا جوڑ
لے۔“

”اپن، جورو سے ما تھا نہیں جوڑنے کے۔ جورو کیا ہوئی، پاؤں کی جوتی۔ جوتی
جب جی چاہا اتار دی، پھینک دی، بدل لی۔ بھولے بادشاہ-----بیار سیتا کو جب
رام جی نے بن بس دیا، تو اس نے پوچھا تھا، اس نے-----تو بڑا اوتار بنا
پھرتا ہے۔“

”یہ بات نہیں آگیوان-----بات یہ-----“

”بات دات تو نیزنا-----کیا رہن رکھے گا سب کو، اس ساہوکار سانپ
کے...؟ گروی بیٹھنا، وہاں سب کے سب-----آگیوان جلا کر اٹھ کردا ہوا۔

(۲)

”کھالے، کمی کا لکر۔“ کئی، چھیر اس کے سامنے دھیلتے ہوئے بولی۔ لیکن مگنوا
گم متحان بیٹھا تھا۔

”آج گم سم کیوں ہو؟ بولوں۔ کچھ اونچی بیچ ہو گئی کیا؟؟؟“

مرمل سے پیاز پر کہ تانتے ہوئے مگنوا کی گھروالی نے پوچھا۔

”جی اچھا نہیں ہے؟ کچھ کھا پی لو، نیند آجائے گی۔“

”تجھے کھانے اڑانے کے علاوہ کچھ سوچتا بھی ہے؟ وہ تیرے باب، ساہو کار کے

خالم بیٹھے نے پکڑ میں ڈال دیا آج ۔۔۔۔۔ کرنے لگا مجت پہ مجت اور بولا پائی پائی کا
حباب کرنا ہے تو پہنچ جاؤ گروئی ۔۔۔۔۔ " سکھوا زخم کھا کر اکھڑا۔

”مگر وی...؟ کئی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔“

”موقع دیکھ کر مجھے بھی باڑا دے تو جانتی نہیں چھیسے۔ تجھے اور مجھے اب ساہو کار کے گروہی بیٹھنا پڑے گا۔ زندگی بھر کے لئے جان بار کر بیجا اس کے کھیت، پورتا کھلیاں اور بھرنا اس کا قرض حاصل نہ وصول۔“

”اور یہ پہنچ کے...؟“

"یہ بھی ساتھ گروی-----کھائیں گے ساہو کار کے ذخیرہ ذمروں کے ساتھ۔

رچھے کیا؟ تو تو بختی جا۔۔۔۔۔ باز نہ آتا، برس کے برس۔"

"میں اکلی نے جنے ہیں یہ سوچ...؟"

"نیں۔ میں کہتا ہوں۔۔۔۔۔ آئے تمیری ہوتی سوتی ماں بھی پچے جنے

میرے گھر

"اپنی ماں کو گھر ڈال لیتا، وہ جتنی تحرے----- ہوش کر ہوش۔"

"بُوش ہوتا تو دھرتا تھے مرد کے ہاتھ تھیلی، اور لیتا یہ قرض اپنے سر۔"

"میں نے کہا تھا تجھے قرض لینے کو...؟----- اسی سکت تھی تھے میں ؟؟"

"اوے، بھول گئی، ٹھکے لگا کر سامنے نہیں آتی تھی میرے۔۔۔ پھولو بوا سے جتنا پا نہیں تھا کہ۔۔۔ مجھے مرے ہوئے کو کیوں مارے ہے؟"

ہوں؟ ایک وقت کھاتی ہوں تو دو وقت بھوکی مرتی ہوں۔"

"اے ہے، بڑی دلخراشی ہے بھگاری۔ تو چھوڑ کریں جیسیں وہی میرا بندا؟ جا بینے

کی اور کے --- تمہے نصیبوں سے ہن برستا ہے ہے۔"

"اے۔۔۔ اچھے وقوں سے یہ دشمن رعناد بھی یقین ہوتا کہ اولاد کے نتے

کر بھی چل گیا۔ ابھی آگے کی کس نے دیکھی؟“

”آگا چچا خوب سمجھے ہے، ”مورتی۔“

”ہوش بوجھا میٹھی ہوں۔ پیٹ کی بھوک اور کوکھ کی کوڑھ نے پاگل کر کے رکھ دیا۔ تو جانتا ہی ہے۔“

”میں جو کچھ جانتا ہوں تھے بتا دیا۔ گروی میٹھنا ہے، ساہو کار کے، تجھ بھوک۔ لڑکے بالے سب۔“ اب گنوا کے لفظ تھک کر ڈھیلے پڑ گئے تھے۔

”تمرا ساتھ ہے تو گروی بھی رہ لوں گی۔ سر پر چپر اور روکھا سوکھا، جوار باجرہ، کچھ تو دیگا، وہ مرا ساہو۔ قحط کٹ جائیگا۔ کل یئے انھے کھڑے ہوں گے۔“ کنی نے بھیگل ہوئی پلکیں جھپکاتے ہوئے، بے بھی سے گنوا کے گھنٹوں پر بندھے ہوئے ہاتھوں پر اپنا کانپتا ہوا ہاتھ رکھ دیا۔

”ادھر ادھر لڑکے ہوئے، سرجو، چندو ایک دوسرے کی گردن، پیٹ اور سر ناپتے نیند میں جھوٹتے ادھر ادھر لڑکے پڑے تھے۔ یوں جیسے اندر حیاروں کی ٹھیکڑیاں اور پوٹھیاں اور پتے دھری ہوں۔ جاڑے کے مارے، ”چاؤں چاؤں“ کرتے، کتے، چپر کے درمیانی بائس سے اپنے وجود کو رکھ کر گرانے کی کوشش کر رہے تھے۔

کنی نے ٹھیکڑتی ہوئی زمین سے چندو کو سمجھنے کر چنانی پر کر لیا اور اپنے چھٹی دوپٹے سے سب کو ڈھانپ دیا۔ اب اس کے بدن پر صرف ایک بوسیدہ سینہ بند رہ گیا تھا، جو ساہو کار کی بونے اس کی گدرائی ہوئی رنگت پر رسخ کر دیا تھا، اور یئے پھی ہوئی ساڑھی کا آواہا پلو پلتا ہوا تھا۔

چپر کی ایک درز سے چھن چھن کر ظاہر ہوتے ہوئے اجائے کی مدھم روشنی میں نمایاں کنی کی قربت محسوس کر کے گنوا کھدبدایا۔ تب کنی نے اوٹھنے ہوئے اس کی متلاشی الگیوں کو اپنے ہاتھوں میں بکڑ لیا او بددائی:

”کوئی جیلہ کرو نا۔“

”تو ڈھیلے کی کہتی ہے۔ نیک بخت، ابھی شر میں پڑھا کو ٹھیکڑ کا بڑے والا پینا کھتا تھا۔“ اب سرکار زور علم کی مزدوری نہیں رہنے دے گی۔ ساہو کار لوگوں کی پکڑ دھکڑ نوروں پر ہے۔ دیکھنا گنوا، ڈرنا نہیں۔“

چھر ایک لمبی چپ کی چادر دونوں میاں یبوی کے درمیان تنقی چلی گئی۔ دونوں

ابھی بولتے چکتے کہ باہر گرجدار آواز سے کسی نے پکارا:
”سُکنوا ہوا“

چار سو چھلیے ہوئے نالے کو چیرتے ہوئے وہ جواب میں پکارا: ”آیا ہو“
”اتی رات گئے ساہو کار، آوارد ہوا-----رام جی رکھ۔“ کہتا ہوا سُکنوا،
چھپر سے لکھا۔

”ساہو-----پالسار! آپ اور اس جاڑے میں اتنی رات گئے
مجھے بلوا لیا ہوتا۔“

”وہ تو سب نحیک ہے-----میں کہوں، آج بھیترے تیرے، ایسا ویسا بولا
تھا، چوبال میں۔“

”نہیں تو-----چھوٹے ساہو ملے تھے۔ قرض کی بات یاد دلائی تھی۔“
”نہیں-----وہ، گروی رکھنے کی بات کرتا تھا۔ میں سب سمجھوں، پر
بھائی-----مجھے کسی کو گروی نہیں رکھنا۔ زور ظلم نہیں کرتا-----اب تو ایسا کر، کل
یہ میرے چھپر کو چھوڑ دے، کیس اور ڈیرا ڈال۔ جب تیرے پاس ہوا مجھے اونا
دیتا-----پر اب دور ہو جا۔ تمرا ساتھ مجھے لے ڈوبے گا۔“

”پر مالک میں جاؤں کہاں.....؟ میرا دوسرا نھکانہ کوئی نہیں ---- جہاں جا پتوں
ان لڑکوں بالوں کو۔“

”اب تو جو بھی کر، چاہے کیس جا کر رو-----یہ ”زنافی سرکار“ تو ہمارا گلا
ٹاپ رہی ہے۔ نئے قانون پر قانون بن رہے ہیں۔ وہ شکر کے بیٹے کی سی قونے، لیدر بن
رہا ہے۔“

”پر سرکار-----جو بولے اسے بکٹے دو۔ میں آپ کا دیا سب لوٹا دوں
گا۔ اب تو سر جو بھی ہوا ہو گیا ہے۔ چار کی جگہ چھ ہاتھ لگیں گے تو-----“

”زنافی جمع خرچ چھوڑ۔ تب تک میرا جتازہ نکل جائے گا۔ بس کہہ جو دیا، تو کل
یہ اپنا نھکانہ الگ کر لے۔“ اتنا کہہ کر ڈلتا، ڈلتا ساہو کار واپس ہو لیا۔ سُکنوا، کاشھو
کا بنا، کچھ دیر تو دہیں کھڑا رہا، پھر چھپر میں ہو لیا۔
اسے یوں بھونچکا دیکھ کر یوہی نے شوکا دیا:

"چھوٹے؟"

"پھر نہیں—— مقدر کی مار کر۔"

"اب کماں—— کس جگہ ڈالو گے چھپر، کچھ سوچو بھی۔"

"میری سوچ بچار سے کچھ ہوا ہے آج تک...؟ مگنی رات وہ آگیو ان آیا تھا۔
مینڈھ پر بیٹھے بہت کچھ کہتا تھا۔——"

"آگیو ان—— وہ میرے ہوتے سوتے گاؤں کا...؟"

"ہاں، وہی—— کہتا تھا، گھنوا ایک ثواب کا، اور پاپ کاٹ ڈال ساہوکار کا۔"

"کیا ثواب...؟ تمرا لکھنی ہے، اس کے دل میں رحم پیدا ہو گیا، تمہرے لئے۔"

"بچھ پر تو نہیں، البتہ تجھ پر ضرور اللہ آیا ہے، اس کے من میں کچھ——"

"صاف صاف کو، چاہتا کیا تھا وہ۔"

"کھوں گا، تو میری نیت پر شک کرے گی۔"

"بول بھی۔ پاپ تو میں جان گئی، پر ثواب والی کیا بات ہے؟"

"اری مورکھ، کہتا تھا، " ذات بھائی کے ناتے سے ہی سی—— اپنی عورت کو
لا بخا میرے ہاں۔ بس اس کی کوکھ سے میرا بیٹھا پڑ جائے تو——۔" بیٹھے ہی بیٹھے
جو ہوتے آئے ہیں تیرے، اور اس کے بیٹھیاں ہی بیٹھیاں ہیں۔"

"یوں کو، میں اس کا بیٹھا جنوں۔ رے ہم یوں ہم زور ڈگر دیکھیں ہیں تم
کو۔۔۔۔۔ جو رو اور زمین، ایک سمجھو ہو تم مرد لوگ۔۔۔۔۔"

"کہا نہیں تھا۔۔۔۔۔ آخر بھڑک انھی نا۔"

"رہنے دے اسے۔ آئے والے کل کی سوچو۔۔۔۔۔ چھپر کماں نہ رے گا۔"

(۳)

اس سے پکلے کہ جھپٹنا ہوتا اور دھوپ نکلتی، ساہوکار گاؤں کے چنخوں کو ساتھ
لئے سامنے تھا۔ گھنوا دنوں باقاعدہ جوڑے، جیسے پٹ کر کھرا تھا اور اس کے وجود کی اوت
میں کھڑی کئی کانپ رہی تھی۔

اپنے بھاری مونہ سے بھاپ کا گولا چھوڑتے ہوئے ساہوکار بولا: "مگنا ایسا! پانچ بچوں کے سامنے تیرا میرا فحصہ ہے۔ لو دیکھو بچو۔۔۔ یہ لکھت پڑھت ہے بیان کی، جسے میں سب کے سامنے پھاڑ رہا ہوں۔ اب اس کی ادائیگی کا بوجھ ہے مگنا کے سر۔۔۔ اور مگنا بجھ سے جزا ناتا توڑے ہے۔" اتنا کہہ کر ساہوکار نے جمع ان کا غذات کو پھاڑ پھیکا، جو مت سے سکھوا کو اپنے آہنی شکنے میں جکڑے ہوئے تھے۔

کاغذ کے پر زے اوہر اڈ کر بھرنے لگے، تو اسے یوں لگایہے اس کے بینے پر بیٹھنے ہوئے ناگ کا پھن کرچی کرچی ہو کر جھٹکا ہو۔ اس نے ایک اجلہ اور گرا سانس لیا۔ تب ساہوکار آگے بڑھا اور اس کی گھرداری کا سارا سامان سیٹ کر چھپر سے باہر ڈالنے لگا۔ کئی نے آگے بڑھ کر ہاتھ جوڑ دیئے پر ساہوکار نہ رکا۔ مگنا کھڑا انصاف چاہنے کے لئے منہنا تا رہا۔ پچھے ہڑپدا کر نیند سے جاگ اٹھے اور چھپر کے باہر کھڑے ہو کر بلکہ لگھ۔ ایسے میں قریب آؤدا گاؤں ساہوکار کے کھلیان میں سکھا ہو گیا تھا۔

سب کچھ منتشر ہوتا اور خدا دیکھ کر مگنا نے گاؤں والوں کا رخ کیا تو سود سے آزاد کر دینے کی بات کر کے ساہوکار نے سب کو ہمنوا بنا لیا۔ اب مگنا کے سر، ساہوکار کا کوئی ڈنک، ڈنڈا نہ تھا جو فریاد کر کے وہ گاؤں والوں کی ہمدردیاں حاصل کرتا۔ سب بکھر بیٹھ گیا۔ اس کے سر پر آسمان کی چھست کے سوا کچھ نہ تھا، اور ساتھ تھا بسورتی ہوئی عورت اور بیٹلتے ہوئے بچوں کا۔

آنسو الڈے تو کب سوکھے، سکننا کب تھا ہے اور راستے کماں جا کر دم ہوئے ہیں، کون جانے۔ پنگامہ تھا تو یہ اجڑا ہوا کنبہ گاؤں کے ایک سرے پر کھڑے بر گد ٹے بکھرا پڑا تھا۔ دن ڈھلا تو ملگا اندھیرا چھایا، پھر یہ ملگا اندھیرا اوڑھے رات اتری اور سائیں سائیں کرتی رات بھوکوں کو لکھا، ادھ موکر کے پھر دن میں ڈھل گئی۔ ایسے میں مگنا اور اس کی بورو کی ادھ کھلی آنکھوں میں آگیوں کا چہہ سا گیا۔ مگنا کی آنکھ میں کئی نے آگیوں کی شبیہہ دیکھ لی اور مگنا نے یوی کی آنکھ میں عیال داری کی بے بی صاف پڑھ لی، سو۔ دو، دن کی بھوک، مگنا کو آگیوں کی دلپیزہ تک ہاکپ کر لے گئی۔

(۳)

بساہ بھر نہیں پر کھڑے چھٹی چھپر تھے، اپنے لڑکوں کو سنوارا، سنا دیکھنے کی خواہش دوسرے دن ہی سُنی کو خیالوں ہی خیالوں میں آگیوان کے بھرے پرے آگئن اور چوبارے دکھائی۔ اس کے پاؤں کی پانیب بے چین ہو انھی، اجلی ہتھیلی پر مندی رجھنی اور اس کا کندن جسم ریشم میں جا بسا۔

یہ خیالوں کے محل جب نہ رہے ہیں تو کھرد رہے اور ترش تھے۔ ساگ رات کو، کھیر کے پچھے، اس کے گلے میں کانے بچ گئے۔ پی پتی ہوئی، چھٹی، چکدار اور رنگیں گارے کی دیواریں سُنی کے گرد اگر دستی چلی گئیں، وہ پل ہی تو گئی۔ آگیوان سے انھی سُنی بس کے بھجوں اور کپکپاتی ہوئی ڈھلی باہوں کے بچ۔

تلخیج اندھیرے میں وہ آنکھیں ملتی ہوئی انھی بیٹھی۔ سُنی، تو اس نے اپنے چاروں اطراف میں گناہ اور ثواب کے بچے، باہم الجھے ہوئے دیکھے۔ انہیں پکلوں کی اوٹ چھپا کر، چوبارے کے باہر قدم دھرا تو طرف میں بھیگی کھلکھلا ہٹ نے اسے چونکا دیا۔

”تو، تو ہے دوسری کے بد لے آئی ہوئی تیسری۔ میں ہوں آگیوان کی اصل ست پھیری۔ نویں مینے بینا بننے گی، اسی لئے گمراہ ڈالا ہے تجھے۔۔۔ دھوکہ قطعاً نہ کرنا، ہاں...!“

اس اوپر عمر کی سُنی گزروی، چوڑی چکلی عورت نے اپنی نئی سوت کو طعنوں کے ترش کے ساتھ آگھرا۔

”بینا بننے کو جیئے ہے تو۔۔۔ سُبھی، پر بینا ہی جتنا تم رے اختیار میں بھی ہے؟ پر آگیوان نے تو یہی کہا تھا۔ تو نے اپنی کو کہ کے مل نہیں دیکھے کبھی...؟“
ظرف کا نشتر دل میں اتر تو گیا۔ پر وہ بولی نہیں بس بوجل پکیں انحا کر اسے ایک نظر دیکھ لیا۔

”ایسی شرمیلی، جیسے آج ہی بندھی ہو بنتی پلے پل۔ تجا مرد تو میرا ہی ہے۔ دیکھتی جا آگے کا حساب بھی ہو گا ہی۔“ اس کی مسلسل چپ سے چڑ کر بڑی پھٹ پڑی۔
”میرا حساب تو صاف ہے۔ اور وہ کام بھی میں آئی جائے گا۔“ سوت کی

دھونس کا جواب، چاروں ناچار دینا ہی پڑا۔

"حساب کتاب کی ایک ہی کمی تو نہیں۔۔۔ یہ جو سماں کا سواںگ رہائے ہوئے ہے۔ آگے جو چہے گی، بھرے گی، یہ سب میرا اور میرے باپ ہی کا ہے، بھی ہے؟ اس کا نہیں جو تجھے لایا ہے یہاں۔" پہلی بات چیت میں ہی نویلی سوت نے جگر خراش بول داغ دیا تو بڑی پخت پڑی:

"پتا لگ ہی جائے گا تجھے، آگیوں میرے ہی سارے پر کڑا ہے، ہنا ہے۔۔۔ اور تو بھی یہاں تجھی تک ہے، جبھی تک میں چاہوں۔۔۔ بیٹھنے ڈھانے کی نکال جو لگا رکھی ہے۔۔۔ اس باپ کی عمر کے بذے سے کھوٹ پذے سے۔۔۔" اس نے اتنا کہا اور پاؤں پہنچی اپنی پر چھٹی کی اوٹ میں چلی گئی۔

جو ہوا، اور آنے والے دنوں میں جو کچھ ہو گا، وہ اس سے بے خبر تو نہیں تھی، جو بدکتی یا کرلاتی۔ اس نے پاؤں گاز کر کھڑے رہنے کی شانی اور دہاں سے جھکتی ہوئی چلی آئی۔

آگے جو کچھ ہونا تھا، وہ تو اسے جھینانا ہی تھا، اور اب تک جو اس نے سب سے کڑوی اور سکیل بات سنی تھی وہ آگیوں کی شہ پر گستاخ اور آگیوں کی دوسری جوروں کے طاپ سے متعلق تھی۔ کہی نے اس آس پر آگیوں کے گھر بیٹھنا قبول کیا تھا کہ، گستاخ بیسے تیسے دو ایک برس اس کی راہ لکھے گا، اور لڑکوں بالوں کو سنبھالے گا۔۔۔ اور اس کے بدلتے میں طے ہوئے روپوں سے ساہوکار کا قرض چکا دے گا۔

شروع چاند کے پلے پدر حوازے ہی میں اس نے تاکہ گستاخ نے "دوسری" گھر میں لا ڈالی ہے اور اپنے جگر گوشوں کو مار پیٹ کرتا ہے۔ اس کا جی بے قرار ہو اٹھا، اس نے سوچا کہ لوٹ جائے، لیکن آگیوں کی چار دیواری الامگھنا نا ممکن تھا۔ دن میں "بڑی" اس کی گھرانی کرتی اور رات کو آگیوں آ گھیرتا۔ ذات برادری سب آگیوں کے کے نئے میں تھی، عورت ذات کی کون سنتا۔

بڑی کے طفے سختی اور آگیوں کا بوجھ ڈھوٹی ہوئی عورت اب نئے ماحول میں رج بس گئی تھی۔ من کو مار کر گھر کے ڈھور ڈھگروں کے چارہ پانی میں لگی رہتی۔ دو وقت کی کھا کر، سوتے جائے گھر کی گھمداشت میں جنی رہتی۔ پر بڑی کے طفے منے ختم ہونے

بڑی نے طرف کیا۔

”بڑی...! آخر“ ہے تو ’ تو بھی عورت ذات ہی۔ میرے اندر بھی کبھی جھانک کر دیکھو۔ اور پھر جھکو، چپا سے مجھے کیا ہے...؟“ اس نے جھکو کو بانسوں میں سینتے ہوئے کہا۔

”میرے بھرے نصیبوں کا بھی کبھی سوچا ہے تو نے، جو میں آؤں تیری اور———— سانپ بختے کو آئیٹھی ہے میری چھاتی پر————نا، کب بھر رہی ہے کرائے کی کوکھ، میٹے سے……؟“

”یہ طرارہ ہے تو خود کیوں نہیں جن لئی بیٹا ہے کمر میں زور.....؟“ تاکہ کر کی اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے چپبر میں گم ہو گئی۔

(6)

آسمان پاولوں سے اٹا ہوا تھا، اور بدلوں میں مینڈ لک رہا تھا۔ اسے اپنی کوکہ میں سرراہٹ ہی محسوس ہوئی۔ ایسے میں اس کی یادوں کے الہم میں بیچھے رہ گئے نہیں
برجو، پاشاید چندو کی بسورتی ہوئی صورت آتا۔

"برخو تو سمجھدار ہے پر چندو تو ابھی-----" اس نے کتنا چاہا تھا کہ چندو کو ساتھ لے لئی پر آئیوان یہ کہ کر اڑ گیا تھا کہ جب تک وہ گود میں ہو گا، اس کی گود

بلد ہری ہونے کی نہیں اور یوں سارے کئے کرتے پر پانی پھر جائے گا۔ آج اس نے بڑا کہ یہ سب کیسے اور کیوں کر ہوا۔ ایک نہیں دو بار وہ دھوکہ کھا گئی۔ بھی رواج اور ذات برداری کے نام پر اور بھی اولاد کے نام پر ۔۔۔ آخر ملا کیا ہے؟ اب پھر بحث کر میں کانٹا سا چمبا ہوا گتا ہے۔ ایک دکھ کی لہری انھی اور اس کے گلے میں ابکائی اندھیل گئی۔

”بڑی“ نے جب سے اسے بھی ابھولی چھوڑتے ہوئے دیکھا تھا، بس جاڑا مار گیا۔ دن بھر مومنہ ڈھانپے بے سده پڑی رہتی۔ انھی بھی تو مومنہ ہی مومنہ میں بڑا تی اور بات بے بات پر بھکھو اور چمپا کو ڈانت ڈپٹ کرتی ہوئی۔ ادھر آگیوں نے اپنے بچ کو نہرتے نہ، تو ہر طرف سینہ پھلانے مت پھرنے لگا۔

دوسرा دن چڑھا تو اس بات کو جیسے پر لگ گئے اور محل منارے سنی گئی۔ آگیوں نے لاکھ چکنی چپڑی لگا، اپنے جذبات میں بدھ کر ”بڑی“ کو متوجہ کرنا چاہا، لیکن وہ بس ہوں ہاں کر کر رہ گئی۔

اب جب بھی اکیلے میں دوتوں سوتوں کا سامنا ہوتا تو ”بڑی“ بولا کر رہ جاتی۔ اب وہ ہر وقت اپنی کو خڑیا میں دیکی رہتی یا پھر الگیوں پر جمع تفریق کرتی رہتی۔ اب تو اس نے بھکھو اور چمپا کو بھی کئی کے پاس جانے سے روک دیا تھا۔

کئی ”بڑی“ کے دکھوں کو بھختی تھی، پر کیا کرتی۔ اس نے بس اپنے روزمرہ میں فرق نہیں آئے دیا۔ آگیوں کے منع کرنے پر بھی وہ گھرداری میں جئی رہتی۔ ہر بات بڑی سے پوچھتی، لیکن وہ سوم نہ ہوئی۔

دن کئی کو چڑھتے جاتے تھے اور چرے کی رونق بڑی کی تھتھی جاتی تھی۔ آگیوں، باتوں کے پھول کھلاتا اور ”بڑی“ سن سن کر مر جاتی۔ پانچواں ماہ چڑھا تو کئی بھی کھلانے لگی۔ کتنے ہی جنتے تھے اس نے، پر اب کی بار پچھے انوکھا پن ساتھا۔ چھٹا لگتے ہی اس کی کوکھ خوب ابھر آئی تھی اور اس کے جوڑوں میں درد بھی رہنے لگا تھا۔ اب وہ کھنوں سے ٹکی رہتی۔

ساتواں پورا ہوتے ہی ایک رات اسے غصب کا درد انداخا اور دن چڑھنے سے پلے اس کی کوکھ نے بینی اگل دی۔ کو خڑی کے باہر بیٹھے آگیوں نے چجاج کی ”دھپ

دھپ" آواز سنی، تو اس کے ہیوں تھے کی زمین نکل گئی۔ وہ آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا:

دھاڑ رہا تھا کہ ”بُری“ نے قلیت پھوڑا،
”یہ اتنی جلدی کیسے—— ابھی نواں سینہ کب لگا ہے....؟“ وہ پاؤں پٹکا،

”نوں مہینہ کتا ہے، ابھی تو سات بھی پورے نہیں ہوئے۔ ایک ایک دن کا حساب ہے میرے پاس۔ لے آگیوں، تجی کو قونے بیٹھنے کے لئے ان گھر میں لا ڈالا، اور یہ بیٹھنی لے آئی۔۔۔۔۔ اور وہ بھی تمہری نہیں، دوسرے کی۔“ اتنا کہہ کر اس نے قلعہ لگایا اور ہٹ گئی۔

کنی کے نصیبوں پر طوفان ملا دیکھ کر والی نے کہا:
”لوکی تو پوری دلکھ۔ سوت ماہے بیچے، کچھ محب تو نہیں۔“ لیکن اس کی کون
خدا۔

”تونے بیٹے کے لئے اسے گھر میں لا ڈالا، اور یہ بیٹی لے آئی۔۔۔۔۔ وہ بھی تحریک نہیں کسی اور کی۔“ بڑی کے یہ الفاظ آگلوان کے سر کو تجھجننا گئے وہ کوٹھری میں جا گھسا اور آؤ دیکھا نہ تاؤ، نبی کی ولی رطوبت میں لٹ پٹ، کنی کو تھیسٹ کر باہر لے آپا۔ غلیظ گالیاں بکتے ہوئے گرجا:

"خیا مری-----بے شرم، چیلیں-----پرلا ٹھم لے کر میرے ہاں آمری۔ اتنی دغا" یہ فربت؟ کرم کے ساتھ دھرم بھی گیا۔ میں نے اس سخنے ملک کے پیٹ کا دونخ کھول کر اپنی چاندی نہ نکال لی تو میں اپنے باپ کا نہیں۔۔۔ لیکن تو پلے بکل۔۔۔ چھنال، چل پھوٹ یہاں سے۔"

اس نے بھر کر ایک ٹھوکر، سکنی کے دھنے ہوئے پیٹ میں ماری اور وہ مری۔ فریادیں کرتی ہوئی تڑپنے لگی۔ تب بھی آیوان نہ رکا۔ اس نے اسے بازوں میں بھر کر اپنے گھر آگئیں سے باہر ایک گڑھے میں لا ڈالا۔ پھر پلتا اور ہاتھ پاؤں مارتے تو مولود کو اس پر بخخ آیا۔ پاؤں سے زمین ادھیرتے ہوئے مردا اور دائی کو پھٹکار کر باہر نکالتے ہوئے، سب گھر کے افراد سمیٹ، دروازے بھیڑ کر ڈال گیا۔

کسی کی مندی ہوئی پکوں میں نہیں اور پہلے رنگوں کے آسمان کی گردش تھی تو

اس کی آنکھوں میں دھند بھر گئی۔ اسی دھند لکھے میں اسے نہ جانے کیوں کر اپنی کوکھ کی
کلوش دکھتی دکھائی دی، اور اس نے اسے اپنی چھاتی سے چمٹا لیا۔ دھند پھر انھی اور پلکیں
جپچک ہیں۔

جب اس کی آنکھ سکھلی تو کانوں میں گھنٹاں سے بُج اٹھیں۔ ماتھے پر سکھ کی پھونک کا گمان گزرا، اور جب اس نے کوت بدلا چاہی تو سینے پر کیڑے سے ریگتے ہوئے محسوس کئے۔ اس کی کوکھ عی نہیں پہنچی تھی، اس کے وجود کے جوڑ بھی سکھل گئے تھے۔ اب وہ خود کو سرخ رقت پانی میں تمہتے ہوئے محسوس کر رہی تھی۔ جانے کب سینے پر کبلاتے ہوئے کیڑے نے مومنہ کھولا اور ”اوں آں۔۔۔۔ آوں آں“ سے ملتے بلتنے سروں میں روئے لگا۔

”کون ہے تو اور اس آسیب زدہ چوہدے میں کیوں آن پڑی ہے۔۔۔۔۔ اور یہ پچھے کس کا ہے۔۔۔؟“ پچھے کے روئے کی آوازیں سن کر کوئی آکھڑا ہوا تھا اور تفتیش کر رہا تھا۔ سرخ، دبکتے ہوئے چہرے والا سورج، اپنی ہر طرف بکھرتی کرنوں کے ساتھ سیانے بچوں کو اس طرف ہائک لایا۔ قبے کے اس اجازہ کونے پر اس چوہدے کے سامنے، جہاں کئی اس نجی ہی جان نکے ساتھ ہے ہوش پڑی تھی۔

"کون----- کون ہے ری تو...؟"

”کہاں سے آئی ہے.....؟“

”کون لایا ہے تھے...؟“

”کے آئی“

”ہے کوئی آگا یچھا؟“

"بچہ کس کا ہے.....؟"

ریڑھ کی ہڈی کو جھکا دے کر اٹھ رہی۔ قریب ہی پڑا ہوا ایک بڑا سا پتھر انھیما اور
سامنے پنج دیا:

”لو—— لو اس سے مارو—— مار ڈالو“ اس نے اتنا کہا اور ڈپڈبائی
ہوئی آنکھوں کے ساتھ بڑھاں ہو کر گرفتاری۔
اب تو جگت بہا سے نیس رہا گیا۔ وہ لوگوں کی بھیڑ بھاؤ کو ڈپٹی ہوئی آئیں۔
ایسے میں کوئی کٹورا بھر دودھ دلیا لے آیا، یوں ایک دن جیسے تھے میں گیا۔ بڑے کے
بھاگ بھوگ گئے، تب بھی سے سے دو بڑے کے وہاں سے نیس ہے۔ ایسے میں کتنی کی
آنکھوں میں جو قرار دیکھا تو ان دونوں میں سے بڑے نے ڈرتے ڈرتے کہا:
”ماں! ری...! ہم بھی بھوکے ہیں۔“ جانے کون سا جادو جاگا کہ کتنی نے باہیں پھیلا
دیں اور وہ دونوں ان میں سمت گئے۔

چار چھپ دن تک تو کوئی نہ کوئی آتا، دیر یا سوری—— اور کچھ نہ کچھ اس
کے پاس کھانے کو دھرم جاتا۔ لیکن جب اس سے دو جی اور آ جڑے تو سب رک گیا۔ پھر
وہ دونوں بچے آبادی میں بھیک مانگتے اور کھاتے نظر آئے تو لوگوں کی المی ہوئی عنایات
سمت سی گئی۔

اب صبح شام، سرخو اور چندو جو بھیک مانگ کر لاتے، اسی پر گزر برس تھی۔ نیا نو
دن کا دیا دو دن کا۔ اس چوحدے میں سب نے ایک عورت کو ادھر ادھر ہوتے دیکھا۔ وہ
آپ ہی آپ سے باعث کرتی، گالیاں بکھی رہتی، پر اس چوحدے سے باہر قدم نہ دھرتی
تھی۔ اب اسے لیکن ہو چلا تھا کہ مٹکوا، اس مرنے جوگی نئی کو ساتھ لئے، بچوں کو اس
اجانے دیں میں چھوڑ کر کہیں اور جا مرا ہے۔ سرخو اور چندو نے بھی کچھ ایسا ہی تباہ
تھا۔

اب اس چوحدے میں چھوٹے بڑے، چار بھوتوں کے مائے تھے۔ کبھی ننھی سے
لکھاری اور کبھی بھوک کی سکار ان سایوں کے ساتھ ڈوٹی ابھرتی رہتی۔ دن گزر رہے
تھے اور اب اس چوحدے کی یہ نئی آبادی لوگوں کے لئے نئی نیس رہی تھی۔ اول اول
تو کتنی کا آگا چیخا جانے کی خواہش لوگوں میں پیدا ہوئی، پھر جب جگت بہا اور مقامی
عورتوں نے اسے ”پچی دکھیاری“ کے نام سے پکارا تو سب لوگ اسے پاگل اور دکھیا جان

کر منہ موز گئے۔ پہچوں کی بھیک سے چار پیٹ کماں بھرتے ہیں۔
یوں تو بستی میں کھر پھر پلے سے تھی کہ کہ دکھیا پر نکھار آنے لگا ہے۔ من

چلوں میں بات چل نکلی:

"اپنے دتوں میں تو خوب جوہن ہو گا اس پر۔"

بم تو اس وقت پھنا، جب اس دکھیا لگلی کا پیٹ پھولا۔ لوگ باغ دیکھا کئے،

ایک روہت کا سارا تھا اسے۔ بیجوں کی خیر خبر لئے رکھتا تھا جب تب۔

کنی کو زندگانی کے بوجھ اور سانس کی چلتی گوار نے استدر مار رکھا تھا کہ کیسے گزرتی ہے اور کیوں کر گزرتی ہے، کی سوچ بی نہیں آئی۔ زیبگی کے وقت کو کہ میں گئی، اگر وہ آن کی ٹھوکر اور پھر بخے آسان کی آگ اسے اس قدر مار گئی، جھلسا گئی کہ اسے کچھ سوچے بچھے نہ بنتا تھا۔

انی دنوں جانے کیسے اس کا پلا شوہر یا کیک اس سے آن ملا:
 ”کنی۔۔۔ تیرا یہ خردیکھ کر آنکھیں جلتی ہیں۔ تجھے گنوا کے حوالے کیا
 میں نے گناہ سیرا۔۔۔“ اس نے کہا تھا۔۔۔

دن چڑھا تو وہ داسیں باسیں ہو گیا۔ اور انگلی رات پھر آیا۔

”تیری کوکھ میں انگارے بھر کر، میں بھی کب سکھی رہا۔۔۔ آج بھی تم تے
 بنے ہوؤں کو پروں تلنے لئے بیٹھا ہوں۔ دوسری کلائی میں چوڑی نہیں ڈالی۔۔۔“
 کنی کو چپ دیکھ کر بولا:

”کچھ تو بول۔۔۔ جانے دے جو ہوا سو ہوا۔۔۔“

”وہ دونوں ہیں۔۔۔؟“

”نصیبوں کی بات ہے۔۔۔ چھوٹے کو تپ چڑھا۔۔۔ بچا نہیں“ اتنا کہ
 کر اس نے اپنی آنکھوں کے کونوں کو سمجھا کر پلکیں جھکا لیں۔ کنی نے سکری، ذوقی ہوئی
 سانس لی، تو وہ بولا:

”جو ہوا، ہری نام کو مان، اور میرے ساتھ چل۔ ہم ایک بار پھر گھستی کا سامان
 کریں گے۔“

”جی۔۔۔؟“ کنی کے موئہ سے جانے کیسے پھوٹ پڑا۔

”جی کرتا ہوں۔ قسم لے لے۔۔۔ بیاہ تو میں نے ہی رچایا تھا تجھے
 سے۔۔۔ اصل دین دھرم کا (ھن تو میں ہی ہوں تیرا نا۔۔۔) وہ تو سب یار دعا باز۔“

”یہ جو تین پچھے ہیں، ان میں تیرا ایک نہیں۔۔۔ برو ہو اور تھا،
 اسے گنوانے جانے کدھر کیا۔۔۔“ کنی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”تیرا میرا اب چھوڑ۔۔۔ تیرے، سو میرے۔۔۔ برو کو بھی ڈھونڈ نکالوں
 گا۔ اپنا بیٹا اب بانس چھونے لگا ہے۔۔۔ تجھے بست پوچھتا ہے، کبھی کبھی۔۔۔ اور دل
 چھوٹا کرتا ہے اپنا۔ تو چل میرے ساتھ۔۔۔ وہ کتنا خوش ہو گا۔“

اس نے آنکھیں چکا کر کہا تھا، اور انہیں پڑتے ہی پھر گیا تھا۔ کنی اس میں کچھ ڈھونڈ
 نکالنے کے لئے اپنی آنکھیں کھولے ہوئے تھی۔ تسلی رکھ کر اس نے بیڑی کو آگ دکھائی،
 اور سلتنی ہوئی دیا۔ سلائی کو کنی کے چہرے کے قریب لا کر فضا میں بجھا دیا۔ پھر ایک گمرا

کش لیکر اس نے دھواں کنی کے مومنہ پر چھوڑ دیا۔

"بیاہ اور دین دھرم کے ناتے یونہی نہیں ٹوٹا کرتے" اس نے یہ کہتے ہوئے کہی کو اپنی اور سخنچی لیا، تاہم جوڑنے کے لئے اس نے ہاتھ بڑھایا اور وہ اسے نہ روک سکی۔

(1)

وہ کب روک سکی تھی کسی کو۔ سوریے، پوچھنی۔ گمرا، جیسے رنگوں کی کند ہو،
پر سورج دکھائی نہیں دیا۔

اس نے آج سرخو اور چندو کو بھیک مانگنے، نہیں جانے دیا تھا۔ وہ دن چڑھے تک آنے والے کی راہ بھکتی رہی۔ پر جانے والے کب آئے۔ آیا کچھ اور نہی۔ دن پر دن بنتے چلے گئے، اور جب اس کی خبر ملی تو کسی نے اپنا ماتھا پیٹ لیا، یاں توق ڈالے، چڑھا پیٹ ڈالا، سرخو اور چندو کو مار بھکایا، اور آگیو ان کی دی ہوئی آگ کو وہیں کھلے میں ڈال کر ساری آبادی میں بکتی بھکتی رہی۔ لوگوں نے ہمدردی جاتائی، بخوبیا، مکھلایا، پر کچھ ہی دنوں میں اس کی کوکھ کو پھولتے ہوئے دیکھ کر، دھنکارا، پھنکارا، لیکن پکلی جان کر کچھ دعا بھی۔

اب اس کا بیکرا اسی چوہدے میں تھا۔

(4)

قبیل کی کچی را اول پھر سرخ تکون کی سفید موڑ کارڈوڑی تھی۔ دھول اڑاتی ہوئی۔ سکھر سکھر جا پے تھے۔ بند پنچھے روئی آتھے۔ چوک میں بیچائت سکھر کے سلانے شامانہ تھا ہوا تھا۔ مرد، خور قیس دراٹ سئے لئے ہوئے اور ہر کارڈوڑی کا رخ کرتے تھے۔ دھمکا اور

بلا پھلا کر پا پیدا کارندے اپنیں اس طرف ہاک لے آتے تھے۔ ” ” سے کے سے اس شامیانے میں جاتے اور نیلا کمبل اور چیلا کانڈ لئے مرے مرے باہر نکلتے۔ ” تو بھی لے گی کمبل اور نوٹ...؟“

چانک پر کھڑے سفید براق لباس والے نے پوچھا تھا۔ وہ سبی ہوئی کھڑی تھی اور اس کی بغل سے چڑا، سرخ لوٹھرا سا پچھہ، اس کی چھاتی چسرا رہا تھا۔ اس کے پیچھے، ایک کے بعد تین سرخ، چندو اور ننھی———لختہ سے ظہرتے، دُبڈیاتی آنکھوں کے ساتھ، سامنے کمبلوں کے ڈھیر کو نکلے جا رہے تھے۔ وہ سب کو وہیں پھوڑ کر چانک میں سے ہوتی ہوئی اندر جا تھی۔ نیمل پر رجڑ پھیلائے آدمی کے پاس جا کھڑی ہوئی

፳፻፲፭

کوئٹہ نیشنل جی

”تو کئی“

".....مکہ کا،"

“کون مردی؟”

”تمے والا“

31

"کون سے والا جی....؟ پلا رو جا تجا.....؟؟؟"

"کی بنتی ہے۔ اپنے بچوں کے باپ کا نام تبا"

"کون سے والے کا؟ ریکھو، برو، سرجو، چندو، ننکی، پھٹکا----- کس کے باپ

三

"رنے دے۔ یہاں کب ہوا تھا؟"

"جب میرا بہت چھوٹی تھی۔"

”کنی، کنی..... جی چیسے کنوں، دیسے کنی۔ چہبئے میں میرا مومنہ بہت چھوٹا تھا۔ تب کھاتی بہت تھی۔ کہتے ہیں کہ ”مومنہ سوئی - پیٹ کنی“ تو ماں باپ نے کنی نام رکھ دیا۔ آگے بھی تو کنی کا لیکھ ہی ملا مجھ کو -----“

"وہ کیسے؟" اب اسے پلی کی ہاتوں میں مرا آنے لگتا۔

یہ سب کچھ کہتے ہے، اس کی آنکھوں سے جھزی لگ گئی اور وہ بغیر کچھ لے،
تیزی سے مڑ چلی تھی پچاہک کی طرف، پر اس رجسٹر والے کا اشارہ پاکر دو کارندے اسے
پکوڑ کر شامانے کی طرف لے آئے۔ وہ ”نمیں۔ نمیں“ کہتی رہی تھی۔

اسے سرخ ٹکون والے شامیانے کے قریب منڈلا تا دیکھ کر ہی لوگ بات لے اڑے تھے۔ پھر جب وہ کامپتی ہوئی ٹانگوں پر لڑکڑاتی ہوئی بنس میں کبل دا بے، چھانک سے نکلی تو اودھم مچاتے ہوئے بچوں نے اسے آگھیرا تھا، اور اس کے پیچے ہو لئے تھے۔ پھر جب کسی سیانی نے یہ جملہ کسا کہ: "سب کو بھائے، بن شوہر کی ماں" تو ٹکوں نے اسے اپنا نعروی بنا لیا۔ اب وہ آگے آگے، اپنا پسلو کبل سے ڈھانپنے ہوئے چکنے کو انھائے چلی جا رہی تھی۔ پیچے اس کا آپل تھا، سرجو، چندو اور نسمی تھے۔ سرجو نسکی کا بازو تھا، ہوئے چل رہا تھا۔ اس کے بعد نعرو لگاتے ہوئے ٹکوں کا نولہ تھا۔

"سب کو بھائے۔۔۔ بے شور کی ماں" کا نعروں سن کر تو یوں سمجھو، مردوں اور عورتوں کے پیٹ میں مل پڑ گئے تھے۔ ہمیں والے چورا ہے میں تو لا کے چھلوں پر اتر آئے۔ کوئی اس کا کمبل سمجھنے رہا تھا تو کوئی اس پر سکر اچھاتا تھا۔ ایک سکلری ننکی کو جا گئی تو وہ بلبا اٹھی۔ اس پر وہ پیٹی اور مارنے کو چھپنی تو سب بھاگ کھڑے ہوئے، پر پھر اکٹھے ہو گئے۔ پھر وہی نعروں اور وہی مار۔۔۔ وہ رو چڑی۔

میں اسی لمحے اس کی نظر اگلی گلی کے سرے پر دیکھے کھڑے، ایک بڑے لڑکے پر
محشر گئی۔ وہ آنکھ پچا کر چھپ گیا۔ نمرے اب بھی بلند ہو رہے تھے۔ سنکروں کی بارش
اب بھی دسکی ہی تھی۔ پر اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔ اسے تو بس یہ یقین ہو چلا تھا کہ ہو
نہ ہو، سامنے کی گلی کے دوسرے سرے پر کھڑا لڑکا اس کا اپنا برجو تھا۔

"بُر جو اتنا بڑا ہو گیا۔" پر دوسرے ہی لمحے اسے خیال آیا۔۔۔ اس کا اپنا بُر جو ہوتا تو اس کی یہ درگت بنتے دیکھتا بھلا۔ جلدی سے آ، اس کے آگے ڈھال نہ بن جاتا؟؟ اور وہ اسے اپنے سینے میں نہ بھر لئی؟؟

لیکا یک ایک لکھر، کھن سے اس کے ماتھے پر آ جا، پھر بھی اس نے توجہ نہ کی۔۔۔ "پر تھا بُر جو ہی۔۔۔ نہ پچانے مجھ کو، جائے بھاڑ میں، اپنے باپ کی صورت۔"

راہ میں اٹھتی، ڈھیتی وہ سورج ڈوبنے سے پلے اپنے چوڑے کے سامنے جا پہنچی تھی۔

"بے بھیروں جی کی! یہ تو نے اچھا کیا، میری بات مانی، تو کیسے گرم کمبل لے آئی۔" سامنے پر وہت کڑا تھا۔ دامکیں باکس دیکھ کر قریب آگیا اور پھر پھسایا۔ "کبھی ہمیں بھی سلاۓ اپنے ساتھ اس کمبل میں؟" لیکن اس نے کئی کی شعلہ بار آنکھوں سے اٹھتی ہوئی لہیش دیکھ لی تھیں اور سنک گیا تھا ایک طرف۔

آج تمام دن کے بھوکے تھے سب کے سب۔ سر جو، دو پھروں کے درمیاں سمجھا روئی کے نکلوں کو اپنے سامنے بکھیر کر پہنچ گیا تھا، اور چندو اور ننکی اس کے قریب جا پہنچے تھے۔ ننکی باسی روئی کے ایک نکوئے کو چونے میں مگن تھی۔ کئی، چھٹکے کے موڑے میں چھاتی خونیں کر، ڈھال ہی گر گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد سب کے سب گھمڑیاں بن گئے، نیا کمبل پیٹ کر پڑ گئے۔ نئی اون کی گرمائی نے انہیں بھوکے پیٹ بھی جلد سلا دیا۔

کئی کا آنکھ آنکھ ٹوٹ رہا تھا۔ گھری دو گھری تو وہ کوئی بدلا کی، لیکن اب اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

"مائی ری۔۔۔ او مائی" گھپ چپ اندر حیارے میں ایک آواز گوئی۔

"مائی ری۔۔۔ او مائی" کی تیز آواز کے ساتھ ہی اس کھنڈر کی دلیز سے ایک سایہ ابھرا اور پکارا۔

"مائی۔۔۔ اے مائی" کی آواز نے کئی کو چھوا، لیکن جلد ہی وہ اپنے وجود کی دکھن میں ڈوب گئی۔ اس نے جب کوٹ لی ہے تو، پھر وہی آواز:

"ماں۔۔۔ اے"

"کون ہے...؟" اب اسے آواز کی سن گئی لیتے ہی ہی۔

"میں۔۔۔ میں بہجو۔۔۔ تو نے نہیں پہچانا بھے۔ میں کھڑا تھا وہاں۔۔۔"

ساڑیہ اب اندر آگر وجود میں ذہل چکا تھا۔

"پہچان گئی تھی تجھے۔۔۔ کیوں آیا اوھر؟" وہ درد میں ڈوبی آواز میں بولی۔

"ماں۔۔۔ میں تجھے لینے آیا ہوں۔۔۔ چل اب اپنا گھر ہو گا۔۔۔ دیکھے

میں کتا بڑا ہو گیا ہوں۔"

اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گیا۔ تب "کھر" کی آواز آئی، اس کے ہاتھ میں جلتی ہوئی ریا سلالی کی لو، اندر ہیرے کو نگل گئی۔ بیڑی سُلگی، اور دھواں پھیل گیا۔

"باؤ بھاگ گیا نئی کے ساتھ۔۔۔ ماں میں نے کتنے دکھ جھیلے۔۔۔ پر اب ب سُنھیک کر لونگا۔ اب میں بڑا ہو ہو گیا۔۔۔ پورا مرد۔۔۔ دیکھے۔۔۔" اتنا کہہ کر وہ آسون اور امیدوں کے ساتھ اس کے پاس کھک ک آیا۔

"آ مرد۔۔۔ اجائے کے دیکھے بجائے مرد۔۔۔ اندر ہیرے میں تو

بھی آ۔۔۔"

ان سُلگتے ہوئے الفاظ کے ساتھ وہ سیدھی ہو کر پر گئی۔



خورخے لوئس بورخیس: تعارفیہ

خورخے لوئس بورخیس (JORGE LUIS BORGES) کا پچھن اور لوکھن نوکمات سریت، یونس آرس (ارجنتینا) کے اس چھوٹے سے مکان میں گزرا، جس میں دو برابر کے صحن تھے، ایک گھر کے سامنے اور دوسرا پچھواڑے۔ سامنے والے صحن میں شترنج کی بساط جیسی ٹائکوں کا فرش تھا اور پچھواڑے میں ایک کتوان، جس میں ایک بڑے پچھوئے کی موجودگی ثابت تھی۔ سو، بورخیس نے اپنے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر شترنج کی بساط پر چلانا سیکھا اور پچھوئے زدہ پانی پیا۔

کہا جاتا ہے کہ یونس آرس کے وہ مکان کرائے پر سمجھی نہ ائمھے، جن کے کنوئیں پکھوؤں سے خالی تھے۔ یوں بورخیس کو زمین پر قدم جما کر پڑھنے کے لئے شترنج کی بساط ملی اور فطرت سے ہمکلام ہونے کو پچھوئے سے پر کتوان۔ وہ یورپ کی انتہائی حدود پر دم توڑتی مغربی تنہیب کا چشم دید گواہ تھا۔



لاٹینی امریکا اور ہسپانوی ادبیات کے نمایاں ترnam، خورخے لوئس بورخیس (۲۳ اگست ۱۸۹۹ء - ۱۹۸۸ء) نے جنوبی امریکا کی ریاست، ارجنتینا کے صدر مقام یونس آرس کی نوکمات سریت پر اقامت پذیر ایک عام سے روایتی گھرانے میں آنکھے نکھولی۔ اس کے بعد ادا ۱۹ ویں صدی میں ارجنتینا کی قوی آزادی کی جدوجہد میں سیاسی اور عسکری سلح پر محرک کردار رہے تھے۔

بورفیں کے گھر میں اس کے والد کی جمع کردہ کتب کا ایک بڑا ذخیرہ تھا، جس میں اس نے وہ تمام کتابیں بھی ایک کے بعد ایک 'پڑھ ڈالیں' جنہیں پچھوں کے لئے منورہ قصور کیا جاتا تھا، خصوصاً رچرڈ برٹن کی ترجمہ کردہ "الف لیلہ" اور شرق و مغرب کے قدیم عشقیہ قصہ۔

بورفیں پدرہ برس کا تھا، جب اس کے والد کو بیٹائی کے زائل ہو جانے کے سب قتل از وقت رہا، مفت قبول کرنا پڑی اور ان کا مختصر سا کتبہ ۱۹۱۳ء میں قمت آنے والے یورپ کی طرف نکل کردا ہوا۔ برطانیہ اور اطالیہ میں مختصر قیام کے بعد یہ لوگ جگ عظیم اول کی تباہ کاریوں کے سبب جنیوا، سویٹزرلینڈ کے ہو رہے، جماں سے بورفیں نے ٹانوی درجنوں کی تعلیم حمل کی۔ ۱۹۱۹ء میں بورفیں اجین خل ہو گیا۔ جماں SEVILLE MAJORCA تحریک کے سرخیلوں، خصوصاً

GERARDO DIEGO ' GUILLEMO DE TORRE

اور REFAEL CANSINOS سے رہیں۔

استعارہ سازی اور ایمجری سے متعلق اس اولی تحریک کے زیر اثر بورفیں نے اپنی شاعری کا آغاز کیا۔ اس کی پہلی نظم "HYMN TO THE SEA" میں "GRECIA" مجلہ "MAGAZINE" سے شائع ہوئی۔ لیکن درحقیقت وہ والد و نیمن سے متاثر تھا اور اس کی "اس وقت کی شاعری بیتے ہوئے ارجمندنا کی صدائے بازگشت تھی۔" اجین میں نیمن برس کے قیام کے دوران ارجمندنا کی دھنڈی پادیں اور بورفیں کی لاینیت، میکڈونو کے ٹکری بھاؤ میں بھے گئیں۔ ۱۹۲۱ء میں جب بورفیں دوبارہ یونس آرنس، ارجمندنا کی جانب پڑتا تو اس نے حسوس کیا کہ وہ اس وقت تک مجھن اور لڑکن کی چشمی ہوئی یادوں کی یروات سے بکسر تھی دست ہو چکا تھا۔ البتہ، اجین میں قیام، آواں گار تحریک اور تحلیقی سلسلہ پر میکڈونو سے جذباتی لگاؤ نے بورفیں پر یہ امکشاف ضرور کیا کہ دنیا کو جانے، وقت کو سمجھنے اور زندگی کے اور اس کے باوجود ہم جو کچھ سمجھ پاتے ہیں، اسے ہیئت لفظوں میں بیان کرنے سے قاصر ہی رہتے ہیں۔ وہ یوں کہ لفظ تو ہیئت تحریک کو پہلے ی فرض کر لیتے ہیں۔ صوفی اپنے خدا سے ہم کلائی کو لفظوں میں کیوں کر ادا کرے....؟ اس نے کہ لفظ تو اپنی

حکیل کے جلد مراحل گزارنے میں فرسودہ تحریات کی نذر ہو چکا ہوتا ہے۔
یوں، بور خیس نے اپنی شاعری میں استعارے تراشنے شروع کئے، تاکہ انسانی
بلون میں چپی ہوئی حقائق کو لفظوں کا آہنگ بخشا جائے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب اس
نے اپنے وطن واپسی پر اپین کی ULTRAISM کی تحریک کی بنیادیں رکھیں اور اس
کے نظریہ ساز شاعر کے طور پر ابھر کر سامنے آیا۔ اس نے یونس آرس میں اپنے ہی
تکمیل کردہ ادبی گروپ خصوصاً

اور

FRANCISCO PINERO

NORAH LANGE

"PRISMA" کے ساتھ مل کر ایک مصور ادبی جریدہ "GONZALEZ LANUZA"
جاری کیا، جو پوپری صورت میں شائع ہوتا تھا اور سب دوست اسے یونس آرس کی
دیواروں پر چپاں کر دیا کرتے تھے۔ لگ بھگ تین یوں تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۲۳ء
میں بور خیس اپنے گھروالوں کے ہمراہ ایک بار پھر یورپ کی طرف نکل گیا اور اسی سال
یونس آرس کے اشاعتی ادارے

"IMPRENTA SERANTES"

"EL FERVOR DE DUEÑOS AIRES"

شائع کیا۔ اور پھر یکے بعد دیگرے "PROA" پبلشرز نے اس کے دو اور شعری مجموعے

LUNA DE ENFRENTE (مطبوعہ - ۱۹۲۵ء) اور

CUADERNO DE SAN MARTIN (مطبوعہ - ۱۹۲۹ء)

شائع کر دیئے۔

۱۹۳۰ء تک اس نے صرف شاعری کی یا مفہیم کئے، "PROA" اور "MARTIN FIERRO" میں شرک رہا اور ارجمندی کی ثقافتی یلغار کا ایسیر۔ خود بور خیس اپنی اس دور کی شاعری کو "وطن دوستی" اور "جذباتیت" کے نام دیتا ہے۔

تین ابتدائی شعری مجموعوں کے علاوہ ۱۹۳۰ء تک اس کے تین مفہیم کے

مجموعے

(1925, PROA) "INQUISICIONES"

(1926.PROA) "EL TAMANO DE MI ESPERANZA"

(1928.GLEIZER) "EL IDIOMA DE LOS ARGENTINOS"

شائع ہو چکے تھے۔ ۱۹۳۰ء میں بورخیس نے "EVARISTO CARRIEGO" کے عنوان سے وہ شاہکار مقالہ تحریر کیا، جس نے نہ صرف اس کی شہرت کو ارجنٹینا سے اخراج کر سارے لاطینی امریکا تک پھیلا دیا، بلکہ ADOLFO BIOY CASARES سے ملاقات کا سبب بھی بنا۔ یہ ملاقات جلد ہی گھری دوستی میں بدل گئی اور ان دونوں نے آئندہ تیس برس متعدد ادبی منصوبوں پر مل کر کام کیا۔ جاسوسی کمانیوں کی سیرز تین جلدیوں میں مکمل کی، دو فلموں کے سکرپٹ لکھے، دو جاسوسی کمانیوں کے انتخاب کئے اور دو دیگر خیم انتخابوں میں مرتب کیے۔

۱۹۳۲ء میں بورخیس کے متفق نیز قلم سے متعلق مضامین کا مجموعہ "DISCUSSION" لگا اور ۱۹۳۳ء میں ارجنٹینا کے مشہور اخبار "CRITICA" کے لئے اس نے باقاعدہ ادبی کالم لکھتا شروع کیا۔ یہ سلسلہ تحریر قائم رہا، یہاں تک کہ اسی اخبار کے ایڈیٹر کے طور پر اس کا چنانچہ عمل میں آیا۔ اب اس نے باقاعدہ افسانہ نگاری کا آغاز کیا اور ۱۹۳۵ء میں اس کے انسانوں اور حکایات کا پہلا مجموعہ "HISTORIA UNIVERSAL DE LA INFAMIA" کے نام سے شائع ہوا۔

ازان بعد جس کا انگریزی روپ

"تاریخ بدنام عالم" (A UNIVERSAL HISTORY OF INFAMY)

کے عنوان سے سامنے آیا۔ ۱۹۳۶ء میں اس کے متفق مضامین کا مجموعہ

"HISTORIA DE LA ENTERNIDAD"

شائع ہوا اور اسی برس بورخیس نے فیصلہ کیا کہ آئندہ افسانوی ادب پر زیادہ توجہ صرف کرے گا۔

۱۹۳۸ء میں اس کے ناپنا والد نے وفات پائی اور بورخیس نے تاکہتہ ہے حالات کے سبب باقاعدہ سرکاری ملازمت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ یونس آرس کی مختصری میونپل لاہبری کے لاہبرین کے طور پر کام کرتے ہوئے اس نے اگلے چار برس کھشن لکھنے پر خصوصی توجہ دی۔ نتیجہ کے طور پر ۱۹۴۱ء میں اس کے انسانوں کا مجموعہ

"EL JARDIN DE LOS SENDEROS QUE SE BIFURCAN"

چھپا اور ۱۹۳۲ء میں حکایات کا مجموعہ "FICCIONES"۔

دوسری جگہ ٹھیم کا زناہ تھا اور ارجینٹنا، بیرون ڈائیٹریٹ کا دکار۔ بور خس کی تحریک حکومت کی نظروں میں باغیانہ لحن کی حالت تھیں جب کہ وہ سمجھوئے کرنے کے حق میں نہ تھا۔ انتخابی کارروائی کے طور پر ۱۹۳۶ء میں اسے ملازمت سے برخاست کر دیا گیا۔ ۱۹۴۹ء میں بور خس نے گزشتہ پانچ برس کی بدحالی اور ڈائیٹریٹ کے تجربات و مشاہدات پر منی حکایات کا مجموعہ "الف" (EL ALEPH) شائع کر دیا۔ اب وہ سرکاری جگہ بندیوں سے آزاد تھا اور جو کچھ اس کے حی میں آتا تھا، لکھتا تھا۔

۱۹۵۲ء میں بور خس کے انتہائی اہم مضمون کا مجموعہ

"OTRAS INQUISICIONES"

کے نام سے چھپا۔ اب بور خس کا نام ہسپانوی ادبیات کے انتہائی اہم اور ممتازہ فی ادباء میں شمار ہونے لگا تھا۔ کچھ یہی سبب ہے کہ یونیس آریس کے معروف EMECE پبلیشرز نے ۱۹۵۲ء میں بور خس کے متعلق کام کو تین ٹھیم جلدیوں میں تکمیل کر دیا اور اسی سال بور خس کے پہلے اہم ناقد اڈالف پریتو (ADOLFO PRIETO) نے بور خس کے فن سے متعلق کتاب

"BORGES Y LA NUEVA GENERACION"

شائع کر دیا۔ یہیں سے بور خس کی عالمگیری شرت کا آغاز ہوتا ہے۔

۱۹۵۵ء میں ارجینٹنا سے بیرون ڈائیٹریٹ کے خاتمے پر نئی حکومت نے بور خس کو بڑی عزت و احترام کے ساتھ یونیس آریس، ارجینٹنا کی قوی لا بصری کا ڈائریکٹر مقرر کیا اور ۱۹۵۶ء میں یونیس آریس یونیورسٹی، ارجینٹنا نے بور خس کو انگریزی اور شامل امریکن ادب کے ماہر پروفیسر کے طور پر منتخب کر لیا۔ ۱۹۵۶ء تا ۱۹۵۹ء تک وقت وہ ان وہ اہم عمدوں پر کام کرتا رہا اور اتنا درجے کی مصروفیت کے باعث ان چار برسوں میں سوائے چند نظموں اور افسانوں کے، وہ کچھ زیادہ کام نہیں کر پایا۔ ۱۹۶۰ء میں اس کا یہ کام "EL HACEDOR" کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔ دوسری طرف عالمی مختاری سے پر بور خس کا بھرپور تحرك ۱۹۶۰ء ی میں محسوس کیا گیا، جب اس کا نزول

حقیقی کام کھرت سے انگریزی میں ترجمہ ہو کر سامنے آیا۔

بور خیس نے ۱۹۳۲ء میں شرقی امریکا کی متعدد یونیورسٹیوں بھول کیجئے یونیورسٹی میں انگلیسی ادب پر تو سیمی پیچھرے دیجے اور یونیورسٹی میں قدمیں انگریزی ادب پر ایک کورس مکمل کوایا۔ اسی سال بور خیس کی انگریزی زبان میں کسی ہوئی اولین تصنیف "FICCIONES" گروپ لیں نے شائع کی، جس کے محاقب نو ڈائریکٹر، نیوارک رکنیڈا نے اس کے افسانوں، افسانچوں، حکایات، مفہماں اور ایک نوچے پر مشتمل جمود "بھول بھلیاں" (LABYRINTHS) ۱۹۳۳ء میں شائع کیا۔

۱۹۳۳ء میں بور خیس نے یورپ کے مختلف ممالک کا سفر کیا، اجین، سویٹزرلینڈ، فرانس اور برطانیہ کی مختلف یونیورسٹیوں کے علاوہ کولمبیا یونیورسٹی، امریکا میں انگریزی اور ہسپانوی ادبیات پر پیچھرے کی سیرز مکمل کی اور اسے متعدد قوی اور مین الاقوامی اعزازات سے نوازا گیا۔

۱۹۴۶ء میں "ANTOLOGIA PERSONAL" (شاعری اور نگاشن کا انتخاب) کے حصہ میں بور خیس اور ڈرامہ نگار سیموئل بیکٹ کو انٹرنیشنل پبلیشورز "FORMENTOR PRIZE" (دوس ہزار ڈالر) کے لئے برابر کا حصہ قرار دیا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں لاس انڈیز یونیورسٹی نے بور خیس کو ڈاکٹر آف فلاسفی کی اعزازی ڈگری دی۔ ۱۹۴۸ء میں اسے

INGRAM MERRIL FOUNDATION کا انٹرنیشنل ادبی ایوارڈ (پانچ ہزار ڈالر) ملا۔ ۱۹۵۷ء میں اسے "امریکن اکادمی برائے ادبیات و فنون" اور "قوی ادارہ برائے ادبیات و فنون" کی اعزازی ممبر شپ دی گئی اور اسی سال کولمبیا یونیورسٹی، امریکا اور آسٹریلیا کی مختلف زبانوں، خصوصاً انگریزی، فرانسیسی، اطالوی اور جرمن میں لاتعدد تراجم ہو چکے تھے اور اسے ادبیات عالم کی صفت اول کے ادباء و شعراء میں جگہ مل چکی تھی۔ یہ الگ قصہ ہے کہ خود ارجمندا میں اس کے مخالفین کی ایک بڑی تعداد اسے ارجمندا کے حقیقت کار کے طور پر تعلیم ہی نہیں کرتی۔

۱۹۵۶ء تا ۱۹۷۸ء، وہ ارجمندا کے قوی سبب خانے کے ڈائریکٹر کے علاوہ یونیورسٹی

آخر یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی کا پروفیسر رہا اور پھر بیانی کے رفتہ رفتہ زائل ہو جانے کے سبب، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر محض یونیورسٹی کا ہوا رہا، لیکن ایک نمایاں تبدیلی کے ساتھ۔ اور یہ پن کے جملے کے بعد اس نے شرکاری ترقیاً ترک کر دی تھی، اس لئے کہ بھائیں لکھتے وقت وہ باقاعدہ ڈرائیور کرتا تھا اور اب اس کے لئے یہ سب ممکن نہ تھا۔ سو اس نے آزاد نظم کا رخ کیا، جسے وہ آسانی کے ساتھ اپنی والدہ پرائیوریٹ سینکڑی یا دوستوں کی مدد سے ضبط تحریر میں لا سکتا تھا۔

وہ پر ایر لکھتا رہا، اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ شترنگ کی بساط روشن اور تاریک خانوں کا ایک لامبا سلسلہ ہے، جسے جیتے جی الاگھے جانا انسان کے مقدر میں نہیں اور کوئی کسی تہ میں بیٹھے ہوئے کچھو سے مکالے کے لئے بیانی کا ہوتا یا نہ ہوتا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہ سلسلہ آخری دم تک قائم رہا۔ یہاں تک کہ ۱۹۸۸ء میں اس نے اپنی بھارت سے محروم آنکھیں بیش کے لئے موند لیں۔



بورفیس کے تخلیقی تجربے کا محور انسان اور مقدر کے درمیان شترنگ کی ایک طویل بازی ہے، جس میں دونوں فریق اگلی چال چلنے کے لئے ایک دوسرے کے مقابلہ ہیں۔ بورفیس کے ہاں اس کھیل کی بہت سی سطحیں اور پر شیں ہیں۔

”ایک بوجھل کونے میں بیٹھے کھلاڑی ست رو مرول کو آگے بڑھاتے ہیں۔

شترنگ کی بساط، سورج نکلنے تک انسیں مقید رکھتی ہے۔

اس بساط پر دو رنگ ایک دوسرے کے خون کے پاسے ہیں۔“

(نعم۔ ”شترنگ“ سے اقتباس)

”وقت مرول کے بغیر

بھجن میں شترنگ کا کھیل کھیلتا ہے۔“

(نعم۔ ”شترنگ کا کھیل“ سے اقتباس)

۱۳ ”مارچ ۱۹۷۳ء کی رات، پراؤ شر کے زلزلہ کا سے کے ایک اپارٹمنٹ میں جزو میر بادڑ نے، جو ایک نامکمل ڈرائے ”دشمن“ ابہت کی ایک تاریخ اور جیکب بوہم کے براہ راست یہودی ماذفات سے متعلق ایک مطالعے کا مصنف تھا، شطرنج کا ایک طویل کھیل خواب میں دیکھا۔ وہاں شاطر دو افراد نہ تھے بلکہ دو عالی مرتبت خانوارے تھے۔ کھیل صدیوں سے جاری تھا۔ کیا شے داؤ پر گئی تھی، یہ کسی کو بھی یاد نہ تھا، لیکن کما جاتا ہے کہ وہ ایک بڑی اور بے نہایت شے تھی۔“

(افسانہ ”پوشیدہ مجرہ“ سے اقتباس)

”قید خانے کی عمارت بلند اور گلی ساخت رکھتی ہے۔ اس کی وجہ ایک نصف کرے کی ہے، اس لئے کہ فرش نے، جو پتھر کا ہے، نصف کرے کو اس کے انتہائی مکن قطر سے ذرا اوپر کاٹ دیا ہے، یوں اس عمارت کے پھیلاو اور اس کی جبریت کا تاثر کچھ اور گھنا ہو چلا ہے اور ایک دیوار اس عمارت کو دو برابر حصوں میں کامنی ہوئی اوپر نکل گئی ہے۔ گو یہ بہت بلند ہے پھر بھی عمارت کی محراجی چھٹت تک نہیں پہنچ پاتی۔ دیوار کی ایک طرف میں ہوں، تیز بنا کن۔۔۔ قولوم کے ہرم کا جوگی، ہنسے پیدرو دی الوریدو نے نذر آتش کر دیا تھا اور دوسری جانب ایک چینا ہے، جو اپنی اسیری کے زمان و مکان کو راز بھرے ہموار قدموں سے ناپا رہتا ہے۔“

(افسانہ ”خدائی ہاتھ کی تحریر“ سے اقتباس)

بورخیں نے جوانی میں حرمت ناک کمایاں لکھیں، لیکن آخر اس کی وہ حرمت ذاکل ہو گئی، جو اس کے قارئین کے پاؤں اکھاڑ دیا کرتی تھی۔ اب حرمت کی جگہ گمراہی بصیرت اور تجربے نے لے لی۔ رفتہ رفتہ وہ اس نتیجہ پر پہنچ گیا تھا کہ حرمت کا ریلا اگر قارئین کے پاؤں اکھاڑ دے تو وہ زمین اور اس کے متعلقات کو تادیریں پہچان پاتے۔ لیکن اس نے یہ بھی کبھی مان کر نہیں دیا کہ صرف حقیقت نگاری ہی اریب کا منصب ہے۔

بورخیں نے اپنے عمد کو پہنچ کرتے وقت اسے قدیم ماضی میں رکھ کر دیکھا، ایسے میں وہ اکثر صدیوں کی زندگیں بھر جاتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آسمانی اور حقیقی کردار

کماں اور کس مقام پر باہم ایک ہو کر ٹھہر کا حصہ بن سکتے ہیں، اور وہ سرزین 'جمان' اس کے آسمانی (ETHEREL) اور حقیقی (REALISTIC) کردار لے جاتا ہوتے ہیں، خوابوں کے جزیرہ نما ہیں۔

"نئے ہیروں کے نثارات، انخیل اور پانی کے کوزے دیکھ کر اس نے جانا کہ علاقہ کے لوگ چھپ کر اسے سوتے ہوئے دیکھے ہیں، نیز اس کی خوش نودی کے خواہش مند ہیں یا اس کے ظلم سے خوف زدہ۔ اسے اپنے جسم میں خوف کی ایک سرد لبر چلتی ہوئی محسوس ہوئی اور وہ فکر دیوار میں مردے دلتانے کا ایک طاقیہ تلاش کر کے اور خود کو پتوں سے ڈھانپ کر لیٹ گیا۔

اس کے مامنے جو مختصر تھا، اس کا حصول ناممکن نہ تھا، اگرچہ مافق الفطرت تھا۔ وہ ایک شخصی خواب دیکھنا چاہتا تھا۔"

(افسانہ "گول کھنڈر" سے اقتباس)

بور خیں کے کھربے پن کی سب سے بڑی شادت یہی ہے کہ اس نے کبھی بھی اپنی تحریروں کے بنیادی ماغذے سے پرده پوٹھی اختیار نہیں کی۔ اس لئے کہ اس کے خیال میں ادب بنیادی طور پر انسانی تجربات و افکار کے لین دین کا کھیل ہے اور اس میں اور بھیل ہونے کا دعویٰ مسحک خیز ہے۔ اس نے خود افسانہ نگاری کے ضمن میں اپنے گرالین پو اور فراز کافکا سے استفادے کا اعتراف کیا ہے اور اپنی ابتدائی شاعری کو والٹ و ملن کے زیر اثر بتایا ہے۔

بور خیں نے خود اکٹھاف کیا ہے کہ وہ پلا شخص ہے جس نے فراز کافکا کو ہسپانوی زبان میں ترجمہ کیا اور کافکا کے فرانے

"عظیم دیوار چین" (THE GREAT WALL OF CHINA)

کو پڑھ کر ہی اس نے

"بابل میں لاڑی" (THE LOTTERY IN BABYLON)

اور "بابل کی لامبری" (THE LIBRARY OF BABAL)

چیزے افانے لکھے۔ بور خیس نے تو یہاں تک کیا کہ اس نے اپنے افانے، افانچے اور حکایات لکھتے اور شائع کرواتے وقت حاشیے ہائے، جن میں نہایاں طور پر ماقولات کی شانداری کر دی گئی ہے۔

بور خیس نے ایڈگر ایلن پو کی طرح محض فیشی نہیں لکھی اور کافکا سے قربت کے باوجود اس کی نہیں بندش اور بنت کا ایک الگ ذائقہ ہے۔ کافکا اور بور خیس کے کام میں بنیادی فرق، ان کی پسند اور ناپسند، نیز طویل جملے کی بنت میں بور خیس اپنا عانی نہیں رکھتا۔ اس ضمن میں بور خیس کا تختیدی مضمون "کافکا اور اس کے پیشوں" بنت سے الجھیرے رفع کرتا ہے۔

بور خیس کی تحریروں میں گھرے انسانی تجربے کو شاخت ملی ہے۔ کما جا سکتا ہے کہ اس کے ہاں لقمان کی فیصل اور زرتشت کی حکایات کے ساتھ ایڈگر ایلن پو اور فراز کافکا کی پرچھائیں باہم ایک ہو کر ایک نیا موڑ کاٹتی ہیں۔ وہ ایک طرف تو "گول کھنڈر" لکھتا ہے اور دوسری طرف "بور خیس اور میں" یا "پوشیدہ مجzenه"، جو ادبیت کی کسی بھی تاریخ سے متعلق ہو سکتا ہے۔

وہ جتنی صارت سے "متین گوشے کا آدمی"

(MAN OF THE REAL CORNER) لکھ سکتا تھا، اتنی ہی مشائق سے اس کا الٹ بھی لکھنے پر قادر تھا، اور جسے ہم ادبیاتی حقیقت پسندانہ فن کا نمونہ کہہ سکتے ہیں۔

اس کی شاعری اور نثر پارے ایک خاص نوع کی شریقت، عین تجربے، مشاہدے اور دانشورانہ تجھی لئے ہوئے ہیں جب کہ اس کے من پسند لینڈ سکپ بالعلوم ارجمندا اور بالخصوص یونیورسیٹیز سے متعلق ہیں۔

بور خیس کے نزدیک یہ کائنات بھول بھیاں ہے، جس پر انسانی جدوجہد اور دانشوری اپنے دائیٰ نقش ثبت کرتی چلی جاتی ہے۔ اس خصوص میں ایماناریا باری نیچا کی کتاب

"BORGES THE LABYRINTH MAKER" (مطبوعہ - نیویاک ۱۹۶۵ء)

مفصل مطالعہ ہے۔

بور خیس بنیادی طور پر یہ کہ تی ہی لست نہ ہے۔ ایکچھے کھلا مکر، مذہب و اخلاق کی

بکر بندیوں سے مادر، جو کسی بھی گھری نظام اور زمانے کا پابند نہیں۔ اسے تو بس جمالیات سے رغبت ہے اور اس کے جملہ کرواروں کو پورا احساس ہے کہ وہ اس زندگی کی بساط پر بھی ہمارے والی جگہ لڑ رہے ہیں، اور یہی انسانی مقدار ہے۔ اس کے ہاتھ اگر کوئی ذی روح فتح مند دکھائی دتا ہے تو خواب کی حالت میں، جب کہ بورخیں کے نزدیک خواب بھی حقیقت کا ہی ایک حصہ ہیں۔ حقیقت اور خواب کے درمیان کوئی واضح احتیاز وہ کبھی نہیں کھینچ پایا۔

بورخیں کی نشر کی نمایاں خصوصیات، اس کا مرصع اسلوب فن، پرکشش روانی اور چست ریاضیاتی اسلوب نگارش ہے ہے وہ خود "فسانہ طرازی" (FICCIONE) کا نام دلتا ہے۔ صرف ایک مثال دیکھئے۔

"زہن واحد کی رات، اسے کسی نے بھی کنارے پر اترتے نہیں دیکھا اور نہ یہ کسی نے بانس کی اس ناؤ کو کنارے کے مقدس پانی میں غرقاب ہوتے دیکھا، البتہ اگلے چند ہی روز میں کوئی ایک شخص بھی اس سے بے خبر نہ رہا کہ وہ گم متحان شخص جنوب سے آیا تھا اور اس کا گھر دریا کے کنارے ان سُنگاخ پہاڑوں میں گھری ہوئی متعدد آبادیوں میں سے کسی ایک آبادی میں تھا، جہاں "زند" یونانی زبان سے آلوہہ نہ ہوئی تھی اور جہاں کوڑہ اتنا عام نہ تھا۔ یقیناً اس خاکستری مائل رنگت والے آدمی نے اپنی ارض وطن کو بوسہ دیا اور اپنی کھال کو ادھیزتی ہوئی خاردار جھاڑیوں کو ایک طرف ہٹائے بغیر (یا شاید انہیں محسوس کئے بغیر) کنارے سے اوپر اٹھ کیا اور خونم خون، مٹلاتے ہوئے جی کے ساتھ گھستا ہوا اس گول احاطے تک چلا آیا، جس کے دروازے پر ایک سُنگی شیر یا گھوڑا نصب تھا، جو کبھی آتشی رنگ کا رہا ہو گا مگر اب خاکستری رنگ کا تھا۔"

(افسانہ "گول کھنڈر" سے اقتباس)

آپ نے ملاحظہ کیا کہ افشاٹے کا یہ ابتدائیہ بھی دو طویل جلوں سے ترتیب پاتا ہے اور اس کا کسا ہوا اسلوب مصور علمی زبان (ICONOGRAPHY) کی خوبصورت مثال ہے۔ یہی سبب ہے کہ بورخیں کو ترجمہ کرتے وقت دنیا بھر کے ماہر مترجمین نے بت سوچ سمجھ کر ہاتھ ڈالا، تب کامیاب ہوئے۔

یاد رہے کہ بورخیں کو انگریزی میں ترجمہ کرنے والا اولین مترجم فرجیلیڈ

لگ بھگ کے لگ بھگ (ROBERT STUART FITZGERALD) ۱۹۳۰-۳۱ء کے، جس نے

اس کی نظموں کے ترجمے کئے۔ یہ ترجمہ "ہم عصر لاطینی امریکن شاعری کا انتخاب"

ANTHOLOGY OF CONTEMPORARY LATIN

AMERICAN POETRY

مطبوعہ۔ نیوزاٹر کیشنز، طبع اول - ۱۹۳۲ء کے صفحہ ۷۳ تا ۷۴ ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں۔

شاعری کے دیگر مترجمین میں

جان اپنائیک پینٹریشو خین (PATRICIO GANNON)

ہیگو ماننگ (HUGO MANNING)

اچ - آر۔ ہیوس (H.R.HAYS)

ہیریت ڈی آونی (HARRIET DE ONIS) اور

ہیرالڈ موری لینڈ (HAROLD MORELAND)

کے نام بہت نمایاں ہیں۔

بور خیس کے انسانے کا پلا انگریزی ترجمہ ڈونالڈ اے۔ یتس

نے

(DONALD A. YATES)

کے عنوان سے کیا تھا جو "THE GARDEN OF FORKING PATHS"

"MICHIGAN ALUMNUS QUARTERLY REVIEW"

بابت - بار ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا تھا۔

افسانوں کے دیگر مترجمین میں

"ANTHONY KERRIGAN" کی ریکارڈ

ہیلن ٹپل (HELEN TEMPLE)

روٹھ وین توڈ (RUTHVEN TODD)

(ANTHONY BONNER) انجوئن بونر

الاستر ریڈ (ALASTAIR REID)

اور ملدریڈ بوئر (MILDRED BOYER) کے نام نمایاں تر ہیں۔

۱۹۶۳ء میں گروو پرس نیویارک نے (FICCIONES) شائع کی، جس میں شامل افسانوں

حکایات اور افسانچوں کے ترجمیں انتحوی کیری گان، 'بیلن پل'، روتھ وین ٹاؤ اور ایسٹریڈ تھے۔ ۱۹۶۳ء میں آشنی یونیورسٹی، نیکس پلیس نے "DREAMTIGERS" شائع کی، جس میں شامل حکایات کے مترجم ملڈریڈ بویز اور شاعری کے مترجم سوری لینڈ تھے۔ ۱۹۶۳ء ہی میں نیو ڈائیمیر یکٹز، نیویارک، کینڈا نے، "LABYRINTHS" شائع کی، جس کے مرتین اور بیشتر افسانوں، 'افسانچوں حکایات'، مضامین اور نویے کے مترجمین ڈوبلڈ اے۔ سیس اور جیس ارلی تھے۔

جب کہ اس سے قبل نیو ڈائیمیر یکٹز، نیویارک ۱۹۷۹ء میں بور خیں کی کتاب

"INVESTIGATION OF THE WRITINGS

OF HERBERT QUAIN"

شائع کر چکے تھے۔ جس کی مترجم میری ولز (MARY WELLS) تھیں۔ اسی طرح ہنوراما پبلشرز، واشنگٹن، بور خیں کی ایک تقدیمی کتاب کا ترجمہ ۱۹۷۲ء میں "ON THE CLASSICS" کے عنوان سے شائع کر چکے تھے۔ بور خیں کے تخلیقی کام کو انگریزی زبان کی معرفت متعارف کرنے میں تاحال آخری کام بور خیں کے ایک ہسپانوی نژاد (ناقد اور شاعر) شاگرد نامس ڈی۔ جوڑینی نے کیا۔ جوڑینی نے بور خیں کی چیدہ نظموں کو ہسپانوی زبان سے براہ راست انگریزی میں منتقل کر کے کتابی صورت میں شائع کروایا ہے۔

بور خیں صرف شاعر اور انسانہ نگار کے طور پر ہی ابھر کر سامنے نہیں آیا، اس کے تخلیقی اخصار کی مختلف جستیں ہیں۔ اس نے مختلف النوع موضوعات پر گھری تقدار ان بصیرت کے ساتھ مضامین لکھے۔ اور ارسٹو، سقراط، فرید الدین عطار، برکلے، شوپنھار، کانت، زیبو، کیرکے گار، میلکو نو، ڈیکارت اور آسکروائلڈ جیسے فلسفوں، کارل یونگ جیسے نفیات دان ہومر، براؤنگ، دوستوفیکی، ولیم جہز، ہان یو، والٹ وٹن، گوئے، ولیم یکسیز، پال گرامک، ملن، ایڈگر ایلن پو، شیونس، راموس، سیجیا، کورچ، جھسٹرٹن، فراز کافکا، بہر بواں، ڈی کوئنی، جو سے مارمول اور اُنیں ایلیٹ جیسے ادباء و شعراء کے کام کو اپنے تخلیقی تجربے کے ساتھ ملا کر دیکھنے اور دکھانے میں تقدیم کے بعد حصے لئے معیارات اور محکمے توڑ کر رکھ دیئے۔ اس کے اس کام کو انگریزی ترجمے کی معرفت

انجمنی پر (ANTHONY BOUCHER)

ای - سی - ولی کاٹ - (E.C.VILLICANA)

جان ایم - فین "GOHNM.FEIN"

جو لین پلے "JULIAN PALLEY"

ڈو لے گس (DUDLEY FITTS)

انجمنی کیری گان (ANTHONY KERRIGAN)

میری ولیز (MARRY WELLS)

اور جمز اربی (JAMESE.IRBY)

نے متعارف کروایا ہے۔ جب کہ بورنیس کے اہم ناقدین میں فرانس کے آندرے مورائی

(JAMESE.IRBY) اور امریکہ کے جمز ای - اربی (ANDRE MAUROIS)

تمایاں تھیں۔

انگریزی زبان کی معرفت بورنیس کو عالمی سطح پر متعارف کرنے کے سلسلے میں
خوب ڈائیگنریشن، جو ناچن کیپ اور گرو پرنس کی سائی قابل داد ہے جب کہ ۱۹۴۷ء میں
ڈن پبلشرز "DUTTON" نے بورنیس کی اہم کتاب "الف اور دیگر افسانے
AUON" اور اون پبلشرز "ALEPH AND OTHER STORIES" نے اس

کی کتاب "تصوراتی موجودات کی کتاب"

(THE BOOK OF IMAGINARY BEINGS)

شائع کی ہے۔

بورنیس نوبل ادبی انعام سے محروم رہا لیکن اس کی زندگی ہی میں جو
عزت اور شرستی وہ صرف اور صرف اسی کا حصہ ہے۔

اردو نثر میں تجھیک تجھیات و مشاہدات اور ویچیدہ جذبات و احساسات کو لفظی
سطح پر سارنے کی قوت تاحال نہ ہونے کے برابر ہے، جب کہ تجھیقی ترجمے کی بڑی خوبی
یہی ہے کہ اصل متن کے جملوں کی ساخت اور الفاظ کی نشت اپنے مزاج کی تکمیل ہم
آہنگی کے ساتھ منتقل ہو۔ یوں بورنیس کے تراجم کے طفیل ہماری زبان میں اسلوبیاتی سطح
پر نئی راہیں سوچنے کا قوی امکان ہے۔

خورخے لوئیس بورخیں، مرزا حامد بیگ

جہنم ۱ - ۳۲

صحح کے جھٹ پٹے سے شام کے دھنڈ کے تک، ایک چینا، تیر ہوں صدی کے آخری عشرے میں، چند چوبی تختوں، چند آہنی عمودی سلاخوں، تبدیل ہوتے ہوئے مردوں اور عورتوں، ایک دیوار اور شاید خلک پتوں سے پر پھر کی ایک ہاند کو تکے جاتا تھا۔ اس کو علم نہ تھا، اور نہ ہو سکتا تھا کہ وہ محبت اور سفاکی، جسموں کو چاہنے کی تمناتی سرت اور ہرن سے مستکتی ہوا کی طلب کرتا ہے، مگر کوئی شے اس کے اندر گھٹ گئی اور اس نے بغاوت کی، تب خدا وند، ایک خواب میں اس سے ہمکلام ہوئے، "تم اس ایسی کی حالت میں ہی زندگی کو گے اور مر جاؤ گے، وہ یوں کہ ایک انسان، جس کے بارے میں صرف مجھے علم ہے، تم ایک قیدی ہو لیکن تمی ہو جو اس لطم کو ایک لفڑ دے گزرو گے" خدا وند نے اس خواب میں، اس جاندار کی حیوانانیت کو روشن کیا تب اس نے اپنی وجوہات کو سمجھتے ہوئے اپنے مقدر کو قبول کیا، مگر جب وہ بیدار ہوا تو اس میں محض ایک مخفی توکل تھا، ایک بہادرانہ بے خبری، وہ یوں کہ اس جہاں کی بنت ایک جانور کی سادگی کے بالمقابل پیچیدہ تر ہے۔

برس ہا برس بعد، دانتے، راویتہ میں مر رہا تھا، بالکل اسی طرح بیدار اور تھا، جیسے کوئی اور انسان۔ ایک خواب میں خدا نے اس پر اس کی زندگی اور جدوجہد کا مخفی راز عیاں کیا، اور اس نے اپنی جان کی مخفی کو گوارا کیا۔ راویتہ ہے کہ بیدار ہونے پر اس نے محسوس کیا جیسے اس نے کوئی لازوال شے پا کر کھو دی ہو، ایک ایسی شے جسے دوبارہ بحال کرنا اور اس کی بھلک تک پانا بحال تھا، وہ سوں کہ اس جہاں کی بنت ایک انسان کی سادگی کے بالمقابل پیچیدہ تر ہے۔

"LABYRINTHS"

(مرجبہ۔ ڈوہالڈ اے۔ میش و جیس ای ارلی سے ترجمہ)

فرانز کافکا۔ تعارفیہ

تحقیق کار کا رزق اس کے ذہن اور یادوں کے پڑاۓ میں ہے۔

اس تدبیم کہاوت کے معنی فرانز کافکا کے زندگی کرنے کے جتن اور تحریری سرگئے کو دیکھ کر کھلتے ہیں۔ کافکا، جو ۲۰ ویں صدی ہیسوی کی اوپریں دہائیوں کے جرمن ادب کا ایک منفرد نام ہے اور اس کی شخصیت کی ہر پرتوں ایک لاٹھل مسئلہ۔

کافکا کی تحریروں اور اس کی زندگی کے جتن کو اک دوچے سے جدا کر کے دیکھنا اور پرکھنا بجائے خود ایک بڑا ابہام پیدا کرنے کے متراوف ہے، جب کہ ابہام اور لا جنتیت کی ایک مثال اس کو اپنی زندگی اور دوسری مثال کافکا کی نزول واردات، جو اس کے افسانوں، نادلوں، حکایتوں، خاکوں، روزناتاچوں، تقدیمی محکموں اور خلطہ کی صورت میں بکھری ہوئی ہے۔ کچھ لیکی سبب ہے کہ کافکا کے بن چھوئے نزول منطقے کو اپنانے کے لئے ہے یک وقت وجودی، تاثریت پسند، مارکسی اور نفسی کیفیات کے ماہر۔۔۔ یہاں تک کہ یہودیت اور یہودیت کے علم بردار آگے بڑھے اور کافکا اس کے باوجود کچھ نہ کچھ نقش رہا۔ لیکی بچا کچھا کافکا، خود اسے کسی ایک حد بندی، تفسیر یا تعبیر کا پابند نہیں رہنے دیتا اور اسی کا نام ”کافکائیت“ ہے۔ اور یہ جو کچھ بھی ہے، اس کی ایک سے زائد جائز تعبیریں ملکن ہیں۔

کافکا کی شدید دردوں بینی، خود اذیتی اور خدائی کے انوکھے تال میل نے دھنڈ، اجڑپن اور تاریکی کا ایک ایسا ناٹ میز رہا ہے، جس نے جرمن ادب سے اور اٹھ کر چیک (CZECH) اور اچھریزی زبان کی معرفت عالمی ادبی مختار نامے پر اپنے گھرے اثرات مرتم کے۔

کافکا نے ۱۹۲۰ء میں جرمن ادیب گستاؤ جانوک سے مکالے کی ابتداء کی اور یہ سلسلہ ۱۹۲۱ء تک جاری رہا۔ گستاؤ جانوک کی معرفت کافکا کے تحفیدی افکار لگ بھگ ۱۹۲۲ء میں مظہر عام پر آئے۔ بودلیر سے متعلق بات کرتے ہوئے کافکا نے کہا۔

”شاعری ایک مرض ہے لیکن بخار کو دیانت سے کوئی صحت مند نہیں ہو جاتا۔ اس کے برخلاف، بخار کی حرارت سے تطہیر اور خوبی ہوتی ہے۔“

اس نے تخلیق کاروں سے متعلق کہا تھا۔ ”فن کار کے لئے فن محض کرب ہے اور اس کرب کی معرفت وہ خود کو مزید کرب انگلیزی کے لئے تیار کرتا ہے۔ تخلیق کار کوئی دیو نہیں ہوتا“ وہ تو اپنے وجود کے قفس میں ایک طائر ہے جو دیگر لوگوں کے مقابلے میں کم و بیش رنگین ہوتا ہے۔“

گستاؤ جانوک نے نیور درستو فلکی سے متعلق کسی تخلیق کار کا یہ قول کافکا کو سنایا کہ ”درستو فلکی کے ناول جنوں اور پریوں کی کہانیاں ہیں مگر خون میں تر۔“ کافکا نے جواب میں کہا۔ ”جنوں اور پریوں کی کوئی کہانی ایسی نہیں ہوتی جو خون میں تر نہ ہو۔ ایسی جملہ کہانیاں خون اور دمشت کی گمراہیوں سے جنم لیتی ہیں۔“

خود کافکا کی کہانی نے خون اور دمشت کی گمراہیوں سے جنم لیا۔

فرانز کافکا ۳، جولائی ۱۸۸۳ء کو پراؤ (چیکوسلوواکیہ) میں ایک چیک بودی تاجر ہرمن کافکا کے ہاں پیدا ہوا۔ میکس براؤ اور ایڈ منڈولسن کے مطابق فرانز کافکا نے ہیش اپنے جسم اور قدرے درست مزاج والد کے سامنے خود کو بیچ اور کمزور پایا۔ کافکا کے لئے باپ ہی کی شکل میں سی، زیادہ با اختیار شخصیت (FATHER FIGURE) کا وجود ناقابل برداشت تھا۔ اس نے اپنے والد کے نام ایک خط میں لکھا۔

”اگر میں آپ کے اثر سے کلی طور پر آزاد پروان چڑھا ہوتا، تو بھی میں آپ کے ذہب کا انسان نہ بن پاتا“ میں شاید پھر بھی قدرے مریض سا، بزدل، پچکچاہت کا شکار، پے چین سا شخص بنتا۔ بات صرف یہ ہے کہ آپ جیسے بھی ہیں یعنی میرے باپ کی حیثیت سے، آپ میرے لئے کچھ زیادہ ہی قوت مند ثابت ہوئے ہیں۔“

کافکا کو اپنے بچپن اور لاکھن کے اس احساس کمری سے ساری زندگی چھکارا نہ ملا۔ تپ دل میں بجا ہو کر یہ احساس مزید بڑھا، نتیجہ میں سرد اور تاریک کرے اس کی

آخری پناہ گاہ بنے۔ ابتدا میں اوپ اور طب سے رغبت رہی۔

کافکا کی پہلی تخلیق (THE JUDGMENT) ۲۲ نومبر ۱۹۱۳ء کی رات ظہور پذیر ہوئی جب شمالی اس کے لئے ہاکیل برداشت بن گئی تھی۔ روزناچہ لکھنے کی عادت اسے لا کہن سے تھی اور یوں کافکا نے اس بھیج بھری کائنات کو اس کے بھارے اسردہ سیت صفحہ قرطاس پر اترانے کا ہٹن کیا۔ اسے اس بات کا پورا شعور حاصل تھا کہ زندگی مختصر ہے، سو اس نے بیتے ہی، بچتے خواب دیکھے انہیں جملہ جزئیات کے ساتھ اپنے روزناچوں میں قلم بند کر دیا۔

جی۔ جانیوچ (G.JANOVICH) کے نام اس نے ایک خط میں لکھا تھا۔

”جب میں لکھ نہیں پاتا تو شمالی کا بخ بست احساس مجھے خوف زدہ کرنے آ جاتا ہے۔“
ایسا کیوں تھا....؟ یہ جانتے کے لئے اتوار ۱۹، جولائی (تہ نامعلوم) کے روزناچے سے رجوع کیا چاہئے۔ کافکا نے لکھا ہے۔

”..... میری تعلیم نے کئی معاملات میں مجھے سخت ضرر پہنچایا۔ میرا بھروسے لوگوں کے انہوں کثیر کے خلاف جاتا ہے۔ یوں کہتا چاہئے کہ میرے والدین، متعدد رشتہ دار، ہمارے گھر میں آنے والے بعض ملاقوں، کئی قلم کار، ایک مخصوص خانہماں، جو مجھے سال بھر سکول لے جاتا رہا۔ اساتذہ کا ایک بھج (جنہیں اپنے حافظے میں باہم سخت سے بینچے رکھنے کی مشقت کرنا پڑتی ہے۔) بھورت و مگر ان میں سے کوئی کبھی نہ کبھی یاد سے محو ہو جائے۔ لیکن اگر میں ان کو اس طرح باہم سمجھا، بینچے کر رکھتا ہوں تو سارا انہوں بھر صورت رفتہ رفتہ کرچی ہو کر گذرا ہو جاتا ہے۔) ایک سکول انسپکٹر، آہستہ خرام راہ گزر غرض یہ کہ یہ دعویٰ ایک خبر کی طرح پورے معاشرے پر شہت باندھتا ہے۔ میں اس بات کا اعادہ کروں گا کہ بد فتنی سے کوئی شخص یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس خبر کی نوک اچانک اس کے سینے، پشت یا پلو پر نہیں آ لے گی۔“

کافکا کو جوانی میں تپ دق کا عارضہ لاحق ہوا۔ قانون میں ڈاکٹریٹ کی سند پالی میکن اسے بطور پیشہ نہ اپنا سکا اور ایک نیم سرکاری ورکر ز انشورنس آفس میں کلرک ہو گیا۔ ازان بعد حصتی بیدہ ایجنت کے طور پر خون تھوکتے ہوئے اس نے مختلف شرودیں کے دورے کئے اور ہانپ کر بینچے رہا۔

میلنا (MILENA) اس کی اجازہ اور تاریک زندگی میں واحد روشن ستارہ تھی۔ جس سے قلبی تعلق کی مدت (۱۹۲۰ء تا ۱۹۳۳ء) بھی خود اس کی اپنی زندگی کی طرح مختصری رہی۔ ۱۹۲۰ء میں کافکا اڑتیس برس کا تھا جب پراؤ (PRAGEE) میں میلنا (پ - ۱۸۹۶ء) سے اس کی ملاقات ہوئی۔ ان دنوں میلنا اس کی ابتدائی نئی تخلیقات کو جرمن سے چیک زبان میں منتقل کر رہی تھی اور کافکا کی زندگی کے صرف چار برس باقی تھے۔ کافکا نے میلنا کو نوٹ کر چاہا۔ اس کے روزنامچوں اور خطوط میں میلنا کے پورے نام کی بجائے صرف "M" کا حرف برتائیا ہے، اور اس نوع کی احتیاط یورپ میں بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔

میلنا کو ان دنوں ویانا (VIENNA) میں اپنی شادی شدہ زندگی کی ٹولیدگی کا سامنا تھا اور کافکا، پراؤ میں "F.B" نامی لوگی سے دوبارہ منسوب رہنے اور متنقی نوٹ جانے کے بعد اس جذباتی رفاقت کا حظر، جو میلنا سے میل ہو جانے پر اسے میر آئکی تھی۔ اس حرص میں اس نے اپنے روزنامچے میں لکھا۔

"میں جو کچھ حاصل کر سکا، وہ میرے تھا رہنے کا نتیجہ ہے۔۔۔ اور پھر اس کے بعد (متنقی نوٹ جانے کے بعد) میں کبھی اکیلا نہیں رہوں گا۔ کبھی نہیں۔"

بعد ازاں وہ برلن (جرمنی) منتقل ہو گیا، جہاں وہ کر اس نے محض قلم کاری کی یا محبت کے عبرت ناک انجام کو محسوس کیا۔ اس کے روزنامچوں اور خطوط کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ میلنا کو دن میں اکثر دو تین خطوط ضرور لکھتا اور شادی کو بیشہ وعده فردا پر نہ رہا۔ کافکا نے خطوط لکھنے وقت کبھی دن اور تاریخ کو درج کرنا ضروری خیال نہ کیا، اس لئے اس کے مکاتیب کو مرتب کرتے وقت ولی ہاس (WILLI HAAS) نے خطوط کی ترتیب میں کافکا کے روزنامچوں سے مدد لی اور یوں اس خون اور دہشت کی داستان کو زمانی ترتیب ملی۔

وہ ان قبیل مسلسل خون تھوک رہا تھا اور ازدواجی زندگی کے بوجھ کو اخانے سے قادر۔ ایک خط میں اس نے میلنا کو لکھا۔

"میں تمہیں ہرست سے اپنے قبیلے میں کر لینے کا خواہاں ہوں اور ان ستوں میں حصہ بھی شامل ہے۔ کاش میں تمہاری خواب گاہ کا وارڈ روپ ہوتا، جو ہمہ وقت تمہیں

گھناؤں انداز میں دیکھے گئے ہے۔

میلنا کے نام ایک خط میں اس نے لکھا تھا۔

”اگر شخص خوشی کے سب مر سکتا ہے تو میری آرزو ہے کہ یہ سعادت میرے چھے میں آئے، اور اگر کسی شخص کو موت کے لئے منتخب کر لیا گیا ہو اور وہ خوشی کے سر زندہ رہ سکتا ہو تو میں یقیناً زندہ رہنے کو تیار ہوں۔“

یکم دسمبر، ۱۹۷۱ء کو کافکا نے اپنے روزنامے میں ملینا سے اپنی چار روزہ رفاقت سے متعلق لکھا۔

”طفواني شب و روز میں، چار پر سکون دن۔ اب اس کی جدائی بھی نہ ختم ہونے والے غم ہاک احساسات کا باعث بن جائے گی۔“

اس سے اگلے روز وہ پھر تھا اور روزناچہ لکھتے وقت میلنا کو یاد کر رہا تھا۔

"M" بیش رہے یا نہ رہے۔۔۔۔۔ مگر ایک تاب ناک اصول، تاریکی میں ابھرتی ہوئی ایک روشنی۔۔۔۔۔

میلنا کے نام لکھے گئے آخری خطوط میں سے ایک میں کافنا نے لکھا۔ ”تمہاری موجودگی، تمہاری رفاقت اور تمہاری محبت کے بغیر، میں زندگی کی کرب انگیز کفتون کا مقابلہ نہ کر سکتا اور نہ دیگر لوگوں کے وجود کو برداشت کرنے کے قابل ہوتا۔“

لیکن کافکا اس قابل کب ہوا....؟ یہ اس کا ایک وابستہ تھا۔ اس کے روزتاپے اور خطوط کرب مسلسل، بے چارگی، آکتا ہے اور خود رحمی کی مثال ہیں۔ میلتا سے ملنے کی جتنی بڑی خوشی تھی، اس سے چھڑ جانے کا غم اس سے کہیں بڑا تھا۔ یہاں تک کہ ۲۱ جون ۱۹۲۴ء میں تپ دق نے اس کی جان لے لی۔ کافکا کی موت کے بعد میلتا پورے بیس برس زندہ رہی اور کافکا پر کام کرتی رہی۔ یہاں تک کہ ۷ اگر ۱۹۳۳ء کو (ٹائید) اس سے چاٹی۔

موت کی پناہ میں جانے سے قبل کانکا نے اپنے سوانح لگار، نادر اور قریبی دوست
میکس براڈ کے نام ایک خط لکھا تھا۔

عزز ترین میکس !!

میری آخری فرماںش....!! میرے ماندہ روز نامچے، 'سودات'، 'خلوط'، خاکے وغیرہ، جو

میری کتابوں کے صندوق میں، کپڑوں کی الماری میں، گھر اور دفتر کے ڈھلوان میز میں ملیں
یا کہیں بھی کوئی تحریر پڑی رہ گئی ہو اور تمیس دکھائی دے جائے، اور وہ جملہ تحریریں
اور خاکے بھی، جو تمہارے پاس ہوں یا دوسروں سے میرے نام پر مل سکیں سب کو بنا
تھے جلا دیا جائے۔

فراز

فراز کانکا کو پراؤ (چیکو سلوکیہ) بے یہودیوں کے لئے مخصوص قبرستان میں دفاترے وقت میکس براؤ نے اپنے مرحوم دوست کی آخری فرماںداش کو پورا کرنے سے محفوظی خاہر کی اور یہوں کانکا کے گزر جانے کے بعد اس کے دوستوں اور محققین کو اس کی تحقیق کرہا ناممکن اور مسترد شدہ تحریروں کا ایک بڑا ذخیرہ ہاتھ آیا، جن میں لاقدار حکایتیں، تسلی کہانیاں اور افسانے ایسے بھی تھے جو چند سطور سے آگے نہ بڑھ سکے، اور اس کا سبب یہ تھا کہ زندگی نے کانکا کو بڑی تیزی سے بھگتا دیا اور وقت کا مسلسل گرزاں وامن اس کے ہاتھوں سے چھوٹ چھوٹ گیا۔

کانکا کے اندر کے جس قاد نے اس کی تحریروں میں جھلک دکھائی ہے، اس سے کیس بڑھ کر وہ اچھا ناقد تھا۔ اس نے ۱۹۱۳ء کو اپنے لازوال افسانے "قب متعلق" کا ۔۔۔ (THE METAMORPHOSIS)

”مجھے یہ پسند نہیں۔ شاید اسے لکھتے وقت میں کہیں کھو گیا تھا۔ مجھے اس سے دلگی نفرت ہے۔ اس کا انجام غیر دلچسپ اور پڑھے جانے کے قاتل نہیں۔ ہر لحاظ سے غیر حکمل۔ اگر ملازمت کے سلسلہ میں مجھے باہر جانے کی ضرورت پیش نہ آئی تو بت ممکن ہے کہ میں اسے بہتر انداز سے لکھتا۔“

کافنا، چیک تھا لیکن اس نے اپنے بڑے کام کے لئے جرمن زبان کو بطور میڈیم چھتا۔ اس کی پیشتر حکایتوں، تسلیل کہانیوں اور افسانوں کی طرح اس کے دو نہایات ناول "قلمبہ" اور "مقدہ" میں بھی نا مکملیت کا احساس پایا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کے افسانوں کے مجموعے

(BESCHREIBUNG EINES KAMPFES) "Kampf um die Freiheit"

(METAMORPHOSIS AND OTHER STORIES) "کہاں" نے

میں شامل متعدد افسانے کافکا کی گزران زندگی اور چل چلاو کی کیفیت کے عکس ہیں۔ ناولوں میں "عظیم دیوار چین" اور "امریکا" جیسی قدرے حمل تحقیقات میں بھی منتشر ٹلازیات کا ایک بھاؤ ہے اور ہیئت کے مروجہ اصولوں سے انحراف کی صورتیں، جو قازئین کو تخلی کی ایک ایسی دنیا سے دوچار کر دیتی ہیں کہ کرب، نآسودگی اور تنجی کی موجودگی کے باوجود اس کا احساس مت جاتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے کافکا نے اکثر وابہر سے مدد لی ہے۔ یوں نآسودگی اور بے زاری کا احساس جب جب نفسی خود حریقت (AUTOMATIC PSYCHICISM) کا موجب ہا ہے تو کافکا نے وابہر میں اپنی اور قارئین کی آرزوؤں کی تحریک کا سامان کیا ہے۔

کافکا کی عالم سیر مقبولت کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ قاری محض انہیں واقعات میں دلچسپی نہیں لیتا جن میں علت اور معلول کا رشتہ واضح ہو۔ کافکا کے افسانے سے "قلب ماہیت" اور "ڈوپھی سوار" (DER KIIBELREITER) میں علت سرے سے موجود ہی نہیں، معلول ہی سب کچھ ہے۔ لیکن یہ سب کچھ تو انسانی نفیات کی سطح پر ہوا، کافکا نے تو نسلیم کے ڈراما نگار مارس میترنک اور کیوبا کی افسانہ نگار ڈورا الونسو کی طرح جانوروں کی نفیات سے بھی رجوع کیا اور ایک افسانہ بنوان "ایک کتے کی تحقیق و تحقیق" ایسا بھی لکھا، جس میں مرکزی کردار ایک کتا ہے، جو اپنی اور دیگر کتوں کی حیثیت اور فطرت کی روشنی میں انسانی کردار و افعال کا تجزیہ کرتا دکھائی دیتا ہے۔

کافکا کے ہاں یہ سوالات کی کثرت اور ممکنہ جوابات کی فراوانی کا عنصر اس کی تحریروں کی ایک الگ نمایاں پہچان ہے اور تخلیلی کمانی (PARABLE) کی روایت سے جڑے رہتا، اس کے فن کی ایک اور جہت۔

ہمارے ہاں اردو ادب میں کافکا سے اثر پذیری کی اولین مثال یہد رفق حسین کا افسانہ "کلوا" ہے۔ اس افسانے پر مارس میترنک اور ڈورا الونسو کے حوالے سے بھی بات کرنا ممکن ہے لیکن کافکا کا افسانہ "ایک کتے کی تحقیق و تحقیق" اس سے قریب تر ہے۔ خود یہد رفق حسین نے اپنے افسانے "کلوا" (تحریک۔ لگ بھگ ۳۸ - ۳۷ء) کو اپنا پہلا افسانہ قرار دیا ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہد رفق حسین کے افسانوی مجموعے "آئینہ جرأت" کے جانوروں سے متعلق دیگر سات افسانوں کی تغیری میں کافکا کا کچھ نہ کچھ

حصہ ضرور رہا ہے۔ جب کہ انتظار حسین کا افسانہ "کایا کلپ" اپنی بہت اور اختتامیہ میں کافنا کے "قلب ماہیت" سے بہت قریب ہے۔ کچھ یہی صورت انتظار حسین ہی کے افسانے "آخری آدمی" کی ہے، جس پر آنکھوں (IONESCO) کے شہرہ آفاق ڈرائیور "گینڈے" (RHINOCEROS) اور کافنا کے "قلب ماہیت" کے اثرات نہایت واضح ہیں۔ اس نے انتظار حسین کے دفاع میں یہ کہنا کہ ان کے افسانوں یا ("کایا کلپ") اور "آخری آدمی" میں بالترتیب داستانوی عنصر کی شمولیت اور بدل۔ یہود کے اساطیری ملکے کا ابھار اسے کافنا سے پہلو بچانے میں کامیاب ثابت کرتا ہے، درست نہیں۔ کافنا کے افسانے "قلب ماہیت" کا مرکزی کروار گریگر ساما ایک صحیح اچانک خود کو کاگروچ کی تبدیل شدہ حالت میں پاتا ہے۔

"ایک صحیح جب گریگر ساما پریشان کرنے خواب دیکھنے کے بعد جاگا تو اس نے دیکھا کہ وہ اپنے بستر پر ایک گرانڈیل کیڑے میں تبدیل ہو چکا ہے۔ وہ زرد سبز جیسی سخت پینچے کے مل لینا ہوا تھا اور جب اس نے اپنا سر تھوڑا سا اوپر اٹھایا تو اسے اپنا گیند نما کٹھنی رنگ کا پیٹ وکھائی دیا جو سخت کمان نما حصوں میں پٹا ہوا تھا اور جس پر رضائی بڑی مشکل سے بھی ہوئی تھی، اور یوں لگتا تھا جیسے پھل کر گر پڑے گی۔ اس کے متعدد پاؤں، جو اس کے وجود کے مقابلے میں بے حد نجیف تھے، اس کی آنکھوں کے سامنے بے بسی کے عالم میں مل رہے تھے۔"

یہاں علت معلوم نہیں اور معلوم ہی سب کچھ ہے۔ یعنیہ انتظار حسین کے "کایا کلپ" میں شنزادے کا کمھی اور "آخری آدمی" کا بندر بن جانا علت کو غیر واضح ثابت کرتا ہے اور یہ لکھنی اشتراک کچھ کم توجہ طلب نہیں۔

مجمل طور پر ۱۹۷۰ء کے بعد ہمارے افسانہ نگاروں نے کافنا کو کہیں زیادہ بہتر انداز میں دیکھا اور پرکھا ہے۔ جس کی سب سے بڑی وجہ کافنا کے جملہ کام کا عمومی تاثر یعنی "جمیعت کا گمرا احساس" ہے۔ انسانی پیش بندیاں فطرت کے کام میں رکاوٹ نہیں پیدا کر سکتیں، کافنا کا انسان قمار فطرت سے نہرو آزمائے اور مزاحم ہونے کی سکت نہیں رکھتا۔ نائید اُیزدی سے محروم، تھا اور ناتوان فراز کافنا کا جہاں۔

ڈوپھی سوار

کوئلے کا انت ہو گیا۔ اب کرچھا بیکار ہے۔ آتش دانِ محدثی سائیں لے رہا ہے۔ سارا کمرہ کمر سے بھر گیا ہے۔ کھڑکی سے پرے درختِ نظرے ہوئے کھڑے ہیں اور آسمان، ہر رحم طلب انسان کی نگاہوں کے سامنے ایک نظری پردے کی مانند تن گیا ہے۔ کہیں سے کوئلہ آجائے، وگرنہ میں محمد ہو جاؤں گا۔ میری پشت پر بے رحم آتش دان ہے اور حامنے ویسا ہی آسمان، بس مجھے تو ان دونوں کے بیچ میں سے سفر کرنا اور کوئے والے تک پہنچنا ہے۔ اس نے اب تک میری ہر اتجاہ کو رد کیا ہے، لیکن آج میں اسے باورِ گرو دوں گا کہ میرے پاس کوئے کی راہ تک باقی نہیں رہی، اور اسے یہ بھی کہوں گا کہ اب میں اسے آسمان پر چکنے والا آفتاب تصور کرنے لگا ہوں۔ میں ایک بھکاری کی مانند اس کے سامنے جاؤں گا۔ بعینہ اس بھک مٹکے کی طرح، جو بھوک کی شدت سے بے تاب ہو کر کسی نہ کسی دلیل پر جا بیٹھتا ہے اور آخر کار گھر کی باور جن، دستِ خوان کی جھوٹن کا بچا کچھا حصہ اس کے کاسے میں انڈیل ہی دیتی ہے۔ بس ایسا کچھ ہی کہوں گا میں بھی۔ وہ خالم اور بد خصلت ہی سی، لیکن میں تو اس سے ترس کی اس موبہوم کرن کے ساتھ بھیک مانگوں گا، جو سب سے کہتی ہے۔ ”انسان تو کسی کو قتل نہیں کرے گا۔“

بس ایک کرچھا کو نکلوں کا سوال ہے۔

میری راہ تو صحن ہے ہی، اسی ڈوپھی پر چل نکلا ہوں۔ ایک ڈوپھی سوار کی مانند۔ اب میرے دونوں ہاتھ کٹنے پر جھے ہوئے ہیں، جو اس سواری کی واحد لگام ہے اور میں اسے بڑی مشکل سے چلانا ہوا زینے سے بیچے لایا ہوں۔ ارے ہاں، بیچے آ کر یہ آہستہ آہستہ اپر کو اٹھنے لگی۔ واہ وا، کیا شاندار سواری ہے۔ بیچارے بوجھ سے بیکان ہوتے ہوئے اونٹ، جب ستانے کو تھک کر بیٹھ جاتے ہیں تو شتر سوار کا چاپک انہیں دبلا دیتا ہے۔ وہ اٹھتے ہوئے کانپ کانپ جاتے ہیں، اوزیوں میری سواری سے بہتر انداز میں اوپر نہیں اٹھ پاتے۔ میری سواری، بیچ بستہ گلی میں پہنچ کر اسی شان سے بچکوئے

کھاتی، پڑی جا رہی ہے۔ کبھی کھار تو میں یک منزلہ مکان کے برابر بلند ہو جاتا ہوں۔ لیکن نیچے آتے ہوئے ایک دروازے کی بلندی سے نیچے نہیں اترتا۔

یوں غیر معمولی بلندیوں پر پرواز کرتے کرتے، آخر کار میں کوئلہ گولوام تک جا پہنچا، وہ اپنی میز پر سر نیوز ہائے کچھ لکھنے میں صروف ہے۔ یہاں کی نہایہ اس حد تک گرم ہے کہ دروازے کو کھلا چھوڑ دیا گیا ہے۔

”کوئے والے“ میں سردی سے کپکاتے ہوئے پکارا اور یوں میرے موہنہ سے مجدد سانس کے دخان بھی نکلنے لگے۔

”کوئے والے!! مجھے تھوڑے سے کوئے درکار ہیں۔ دیکھو تو، میری ڈپلچی خالی ہے۔ اس درجہ خالی کر میں اس پر سواری کرنے لگا ہوں۔ مجھ پر ترس کھاؤ، جوں ہی میرے ہاتھ روپے آئیں گے، میں اواسٹگی کر دوں گا۔“
کوئے والے نے کان پر ہتھی جمالی۔

”کوئی آواز دے رہا ہے / شاید.....؟“ اس نے اپنی بیوی سے مخاطب ہو کر پوچھا، جو قریب ہی آتش دان کے پاس بیٹھی آگ تاپ رہی تھی۔ ”تو نے کچھ سنایا؟ مجھے تو کوئی خریدار معلوم ہوتا ہے۔“

”مجھے تو کچھ بھی سنائی نہیں دیا۔“ اس کی بیوی نے یکسر بے پرواہی سے جواب دیا۔ اب وہ پشت کی جانب سے آتش دان کی گری کا لفظ اٹھا رہی تھی۔

”ہاں ہاں میں نے ہی آواز دی ہے۔ پرانا گاہک ہوں۔ تم نے تو مجھ پر ہیئت بھروسہ کیا ہے بس آج کچھ ایسا مجبور ہو گیا ہوں۔“

”ارے“ کوئے والہ بولا۔ ”کچھ من بھی رہی ہے، کوئی آواز دے رہا ہے۔ مجھے یقین ہے، کوئی نہ کوئی دروازے پر ضرور ہے۔ شاید کوئی پرانا گاہک ہے، جبھی تو اس جانے پہچانے انداز میں آواز دے رہا ہے۔“

”تیرے تو کان بخت ہیں۔“ پھر اس عورت نے لخطہ بھر کے لئے سانس روکی اور اطمینان سے دونوں بازوؤں کو سینے پر باندھ لیا۔ ”کوئی بھی تو نہیں۔ گلی سدنماں پڑی ہے۔ سب گاہکوں کو مال پہنچا دیا تھا، اور اب تو دکان داری کا وقت بھی نہیں ہے۔ پھر گاہک کماں سے آگیا۔ یہ تو آرام کا وقت ہے۔“

”لیکن، میں تو یہاں ڈپلچی میں بینخا ہوں۔“ میں زور سے چلایا اور سردی کی شدت سے میری آنکھوں سے پانی جاری ہو گیا۔ ”ارے، زرا تو ادھر۔ تم مجھے یہیں بینخا ہوا پاؤ گے۔ صرف ایک کرچھا کوئوں کا سوال ہے۔ اگر دے دو گے تو کرم ہو گا تمہارا تمام گاہکوں کو مال پہنچا دیا ہے۔ اوه!! مجھے ڈپلچی میں بینخ کر بھی یہ کچھ نہتا ہے۔“

"ابھی آیا۔۔۔" کوکلے والے کی آواز آئی۔

تب وہ پھوٹے چھوٹے قدم اخہاتا ہوا زینے کی جانب بڑھنے لگا۔ پر وہ عورت بھی اس کے ساتھ ساتھ چل دی اور اس کا بازو پکڑ کر بولی۔

"بس رہنے دے..... کماں چلا.....؟..... اپنی درد مندی رہنے دے.... میں جاتی ہوں۔ تجھے اپنے رات رات بھر کھانے کا بھی کچھ خیال ہے....؟ اور گاہک کی آواز آئی، اور انہ کر چل دیا، اور گاہک بھی خیالی۔۔۔ ذرا اپنے یوں بچوں کا بھی کچھ خیال کر لیا کر، اور اپنے بھیرنوں پر بھن ترس کھا۔ ساری ساری رات کھانتا ہے۔ میں جاتی ہوں۔"

"ذکر ذرا مروت سے کام لیتا۔ جو کچھ بھی گودام میں ہے، اگر مائے تو دے دیتا۔ روپے پیسے کی کوئی بات نہیں۔ بعد میں مل ہی جائیں گے۔"

"نمیک ہے، نمیک ہے۔" عورت بولی اور بڑھ کر زینے تک آگئی۔ یقیناً اس نے مجھے دیکھا تھا۔

"بی کوکلے والی..... آداسب.....!!" میں نے کہا۔ "مجھے بس ایک کرچھا کوکلہ چاہئے۔ بس اس ڈوپھی میں ڈال دو۔ میں اسے آپ ہی گھر سے چلاتا ہوا لایا ہوں۔ اگر ثابت نہ ہوں تو چورا ہی ڈال دو۔۔۔ میں تمیں پورے پیسے ادا کروں گا، لیکن ابھی نہیں۔" اف کس قیامت کے یہ دو الفاظ تھے۔

"ابھی نہیں.....!! ابھی نہیں.....!!"

پھر کس بے معنی انداز میں یہ الفاظ، شام کے اس شور میں سکھ مل گئے، جو قریب کے گرجا گھر سے بلند ہو رہا تھا۔

"ابھی نہیں.....!!!!"

"کیا چاہتا تھا.....؟" کوکلے والے نے پوچھا۔

"غاک.....!!" عورت نے پیچ کر جواب دیا۔ "کوئی بھی تو نہیں تھا۔ مجھے تو نہ کچھ سنائی دیا اور نہ دکھائی دیا۔ چھ نیچ رہے ہیں، اسی کا شور ہے۔ ہماری دو کانزاری کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ ارے آج سردی ملا کی ہے اور کل کے لئے کرنے کے کام بھی بہت سے ہیں.....!!!!"

اس نے نہ تو کچھ دیکھا تھا اور نہ سنایا، لیکن اس کے باوجود وہ اپنا لبادہ اتارتے ہوئے، فھا میں گھما گھما کر مجھے وہاں سے چلے جانے کا لہشارہ کر رہی تھی۔ اسے ایسا کرنا ہی تھا۔

میری ڈوپھی میں ایک بڑھا سواری کی جملہ خوبیاں موجود ہیں، لیکن افسوس کہ اس میں مرام ہونے کی صلاحیت قطعاً نہیں۔ بہت سیدھی سادی سی ہے۔ جبھی تو ایک عورت

کے جھولتے ہوئے بادے سے اس طرح آسانی سے بھکت کھا گئی ۔

"چیل.....!!!!" میں چلا یا ۔

تب وہ بے فکری اور نیم چوکسی کے ساتھ کسی کام میں مشغول ہو گئی ۔

"چیل..... میں نے محض ایک کرچھا کو نکلوں کا سوال کیا تھا، اور وہ بھی چورے کا ۔

لیکن تو نے مجھے وہ بھی نہیں دیا ۔"

پھر میں ہیشہ کے لئے گم ہو جانے کی خاطر غبغبہ گھر سے غاروں میں سما گیا ۔



ایمائل زولا: تعارفیہ

فرانسیں ناول نگار ایمائل زولا کی شرت کا آغاز "تھریسا" کے انگریزی ترجموں کے ساتھ ہوا۔ جب کہ اس کے اوپر مترجم اور پبلشر پر لندن میں نوش کتابیں ترجمہ کرنے اور شائع کرنے کے الزم میں مقدمہ چلا۔ اس سے زولا کو عالمگیر شرت تو مل گئی لیکن اس کی تحریروں کو دیگر زبانوں میں ترجمہ کرنے کی ہمت ایک زمانے تک کسی نہ دی کی۔ خود ہمارے ہاں نوش نگاری کو "زولاہت" کا نام دیا گیا۔ اس کے باوجود ۲۰ دوسری صدی میں ۱۹ دوسری صدی کے اس ناول نگار کو عظیم نگشن رائٹر شمار کیا جاتا ہے۔

زولا نے فرانس کے ایک چھوٹے سے قصبے میں آنکھ کھوئی، اس کا باپ پوش تھا اور ماں فرانسی۔ بچپن میں باپ کی وفات کے بعد وہ چھوٹے موٹے کام کرتے ہوئے تعلیم حاصل کرتا رہا یہاں تک کہ پیرس کے ایک اشاعتی ادارے میں ملازمت اختیار کرنے کے بعد زولا نے میں ناول لکھے، جن میں "تھریسا" اور "ناتھا" سب سے نمایاں ہیں۔ جس نگاری کے حوالے سے یہ ناول پڑھنے سے زیادہ دیکھنے کی چیز رہے ہیں، کچھ یہی سب ہے کہ "تھریسا" اور "ناتھا" کی جنسی کروار نگاری نے مغربی مصوروں کو نیوڈ پینٹنگ کی راہ دکھائی اور EDOUARD MANET نے ۱۸۷۷ء میں "ناتھا" کو پینٹ کیا۔

ناول "تھریسا" کے کرداروں میں سب سے مضبوط کروار اس بدھیت اور کمزور کیلیں کا ہی ہے، جو ناول کی پوری فضا کو آخر تک جکڑے رکھتا ہے۔ لارنٹ اور تھریسا ابتداء سے ہی اپنی اصل عادات و اطوار کے ساتھ ظاہر نہیں ہوتے۔ تھریسا، جس نے لارنٹ کے ساتھ وحشائیہ محبت کی تھی، کیلیں سے شدید نفرت کے باوصاف تا دم آخر اداکاری کرتی ہے۔ لارنٹ کے جرم نے اس کی محبت کو دہشت میں تبدیل کر دیا تھا اور

یوں وہ دونوں خطرناک دشمنوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ نباہ کرتے رہے۔
 ناول میں کیلس کے قتل کی تصویر کشی صرکہ کی چیز ہے البتہ ایک بات سمجھتی ہے
 کہ جب کیلس نے دریا میں گرتے وقت لارنٹ کو گردن پر کاٹ کھایا تھا تو فرانسیسی
 پولیس نے تحقیق کے دوران نا اہل کا ثبوت کیوں دیا۔ کیا بدہیت اور کمزور محتول شوہر
 کی خوبصورت بیوی کے ساتھ خوبرو لارنٹ کی جائے حادثہ پر موجودگی کسی شک کو جنم نہیں
 دے سکتی.....؟ بینہ مادر اکون کے ہاتھ پر فائح کے حلے کو ”غیبی امداد“ کا نام دیا جا
 سکتا ہے۔

”تھریسا“ میں چیش کردہ معاشرتی گراوٹ کی مثال مردہ خانوں میں مردہ عورتوں کے
 پستانوں پر رال پکانے والوں کے حوالے سے سامنے آتی ہے، اس کے باوجود زولا نے کسی
 قسم کا اخلاقی درس دینے کی شعوری کوشش نہیں کی اور یہی ہمدرندی زولا کی پہچان ہے۔
 ”تھریسا“ کے دو ترجمے اردو میں شائع ہو چکے ہیں۔ مخمور جالندھری نے اسے ”دل ہی تو
 ہے“ کے نام سے ترجمہ کیا اور مکتبہ دلی نے شائع کیا۔ دوسرا ترجمہ سید حسن رضوی نے
 ”تھریسا“ کے نام سے کیا ہے سید ایڈ سید پل روڈ کراچی نے ۱۹۶۰ء میں طبع کیا۔

مرزا حامد بیگ

امانگل نولا ر مرزا خاں بیک

تھریسا

مُحک و تاریک غلام گردش --- تمیں قدم لامبی اور دو قدم چوڑی گلی کی چھوٹی
چھوٹی دکانوں میں سے ایک دکان، جس میں ستی انگوٹھیاں، نیلی محل کے آبنوی ڈبوں
میں بڑی نفاست سے بھی ہیں۔

اس دکان کے پر ابر کبھی ایک سین زدہ دکان تھی جس کے دروازے پر جلی حروف
میں "بساط خانہ" درج تھا اور شیشے کی بنی ہوئی بار پر سرخ لفظوں میں "تھریسا را کوئین"۔
یہ دکان مادام راکون کی تھی، جو پچھس برس تک اسے چلاتی رہی۔ شوہر کی وفات پر
اس نے دریائے سین کے کنارے ایک مکان خریدا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر الگ
تحلک رہنے لگی۔ اس کا نوجوان بیٹا کیلس، سدا کا بیمار تھا اور بہو کا نام تھا تھریسا۔

تھریسا، مادام راکون کے مرحوم بھائی کی اکلوتی ننانی اور بہت بڑی ذمہ داری تھی۔
مادام کا بھائی تھریسا کو اس کے حوالے کر کے کہیں ایسا کھو گیا کہ پیچھے مذکور نہ دیکھا۔

تھریسا اور کیلس ایک ہی گھر میں، ایک ہی بستر پر سو کر پڑوان چڑھے تھے۔ مادام
راکون نے ان دونوں کی شادی کر دی تو کیلس نے جس میں رہائش اختیار کرنے کا
منصوبہ بنایا۔ یوں باطل ناخواست مادام راکون، پیرس کی اس نواحی بستی میں بساط خانہ
سجائے نکل کری ہوئی اور یوں اس مُحک و تاریک گلی میں وہ دکان تھی، جس میں کاؤنٹر
کے پیچے تھریسا اور مادام راکون بینے تھیں۔ کیلس رحلے کے صدر دفتر میں ملازم ہو گیا
تھا۔

ٹین برس گزر گئے۔ تھریا اور کیل میں میاں یوی کا رشتہ قائم نہ ہو سکا۔ کیل اپنے دفتر سے کبھی غیر حاضر نہ ہوا اور تھریا نے ہمیشہ وقت پر دکان بند کی۔ سلیمان، تاریکی اور غناک سکوت میں گھمی ہوئی تھریا نے خیال کیا کہ زندگی اس کے سامنے ایک سنان صحرائی طرح پھیلی ہوئی ہے، جس کی ہر صبح اس کے لئے ایک بے کیف دن، اور رات ایک سرد بستر لے کر آتی ہے۔

ایک دن مادام راکون کا ایک پرانا شناساً، رٹائرڈ پولیس افسر بیچاؤ وہاں آ لکلا۔ اس نے اپنے نوجوان شادی شدہ بیٹے اولیور کو ان سے متعارف کر دیا، جس کی یوی کیل کی طرح بیمار رہتی تھی۔ اولیور، جسے اپنے گھر میں سوائے آتابہت کے اور کچھ نہ ملا تھا اپنے ایک ہم پیشہ دوست گروٹ کے ہم را مادام راکون کے ہاں وقت گزاری کے لئے آتا اور الی خانہ کے ساتھ شام سات بجے تک ڈامینوز کھیلتا رہتا۔ تھریا نے ڈامینوز کے کھیل میں کبھی دل چھپی نہ لی اور ہمیشہ الگ تحملک عی رہی۔ ایسے میں کیل کا ایک پرانا ہم جماعت لارنٹ پورے میں برس بعد ادھر آ لکلا۔ لارنٹ نے بتایا کہ وہ صورتی کتنا چاہتا ہے اور یہ کہ باپ کے انتقال کا خطر ہے، جو اسے کاشت کاری کے لئے مجبور کے جاتا تھا۔

تھریا پہلی عی ملاقات میں لارنٹ کو دل دے بیٹھی، سو لارنٹ موقع پاتے ہی وحشانہ جرات کر بیٹھا۔ تھریا اور لارنٹ کا ناجائز تعلق ان حالات میں ناگزیر اور فطری امر تھا۔ یوں وہ دونوں اس کمرے میں ملتے رہے، جس کا ایک دروازہ گلی کے زینے میں کھلا تھا۔ کیل اپنے دفتر بیٹھا اور مادام راکون دکان میں مصروف رہے۔

لارنٹ اکثر سمجھیگی سے سوچتا اور اس ناجائز تعلق سے ہمیشہ خوف زدہ ہو جاتا، لیکن اس کا یہ خوف، وسو سے بچری ہوئی خواہشات کے سامنے دم توڑ رہتا۔ تھریا کو اس حرم کا کوئی خدشہ نہ تھا، اس نے تو خود کو اپنے نفس کی راہنمائی پر چھوڑ رکھا تھا۔ لارنٹ جو ہمیشہ کا مخاطب شخص تھا، اپنے کئے پر ہمیشہ پشیمان اور خوف زدہ دکھائی دیا اور تھریا، خود کو بھولی ہوئی۔

”خدا کے لئے“ وہ اکثر تھریا سے بہ آہنگی کرتا۔ ”ایسا شور مت چاؤ کہ مادام راکون آ جائیں۔“

جواب میں تھریسا، لارنٹ کی باؤں میں ہستے ہستے لوٹ پوٹ ہو جاتی۔ وہ اپنے محل پر اندر ہی اندر خوش تھی۔ وہ اکثر اپنے سامنے میر پر بیٹھی ہوئی لمبی کو رازدار بنتے ہوئے خواہش کرتی کہ کاش لمبی کی زبان ہوتی اور وہ تمام راز کی باتیں کیلیں سے کہ سکتی۔

ایک وقت آیا جب اس نے کھل کر کیلیں سے نفترت کا اظہار کرنا شروع کیا۔ اس وقت اس نے کھل طور پر اداکاری کا حق ادا کیا، جو اس مکاری اور دعابازی کا اعجاز تھی ہے اس نے اپنی پرورش کے دوران سیکھا تھا۔ وہ پڑھ رہا برس تک جھوٹ بولتی اور اپنے جذبات کو دباتی چلی آئی تھی اور متواتر یہ کوشش کرتی آئی تھی کہ وہ پر سکون اور خاموش نظر آئے اور اب اس کے لئے یہ کوئی مشکل بات نہ تھی کہ مردے کی طرح پر سکون اور مجید دکھائی دے۔

اب وہ کیلیں اور مادام کو دھوکا دینے میں تجھی خوشی محسوس کرنے لگی تھی۔ اس کے بر عکس مسلسل جسمانی طاپ کے بعد لارنٹ کے لئے بہ وقت ضرورت، صرف اس کے بدن میں دلچسپی رہ گئی۔ جس کی تسکین اور اس کے لئے، تھریسا کا وجود اس کی کمزوری بن گیا۔

لارنٹ نے اپنی اس کمزوری پر قابو پانے کی خاطر بظاہر لا تعلق سارہ کر تھریسا کی چاہت کو پاگل پن میں تبدیل کرنا چاہا اور تھریسا بے پناہ پابندیوں کے باوجود اسی سے چھپ چھپ کر ملتی رہی۔ وہ اکثر شدت جذبات میں لارنٹ کو مخاطب کر کے کہتی۔ ”لارنٹ“ ایسی باتیں سوت کر کہ تم سے رخصت ہونے کی طاقت سلب ہو جائے۔

ایسے میں لارنٹ کی نگاہ مادام را کوئن کی جائیداد پر جھی ہوئی تھی۔ وہ انتہائی قدم اخوانے سے پہلے اتفاقات اور ناکامی سے متعلق اندازے لگاتا رہا۔ یہاں تک کہ سینٹ کوئن کی سیر کے دوران اس نے کیلیں کو قتل کر دینے کا منحومہ بنا لیا۔

اس سفر کے دوران دوپر کے وقت وہ سوئے ہوئے کیلیں کے سر پر اپنا پاؤں، اس انداز سے رکھے رہا جیسے ابھی اسے کچل دے گا اور اس کی یہ خواہش پوری ہوئی۔ کیلیں کے قتل کے ساتھ ہی ان دونوں کی چتاب اور بھیاںک خواہشات کا خاتمہ ہو گیا۔

بھرم جنیت کا یہ ایک ہولناک تجربہ تھا، جس نے تمربیا اور لارنٹ کو ایک دوسرے سے
خفر کر دیا۔

لارنٹ نے تمربیا سے جدا رہ کر ایک ماذل گرل کو تقریباً ایک برس کے لئے
اپنے گھر میں واشٹ بنائے رکھا۔ شادی سے متعلق سچتے ہوئے اس نے تمربیا سے بیوی
کے لئے دست کش ہو جانے اور ماذل گرل کو مستقل طور پر اپنا لینے کا سوچا۔ تب اسے
احساس ہوا کہ اس نے تھنچ ایک بے گناہ کا خون اپنے سر لیا۔ دوسری طرف تمربیا نے
لارنٹ سے دور رہ کر خون اور اعصاب کی وحشی محبت کو یکسر بھلا دیا چاہا۔ اس نے گلی
سے گزرنے والے ایک طالب علم میں دپھی لینا شروع کر دی۔ لیکن یہ سب کچھ محض
خود کو بھلانے کا بھن تھا۔

کیلس کے قتل کے بعد لارنٹ بیک وقت سکون اور بیجان سے لبریز دو مختلف
ادوار سے گزرا تھا۔ پہلے پہل اس نے خود کو بلکا چکلا گھوس کیا اور پھر ایک وقت آیا
جب اس نے سوچا۔

”اس عورت نے اپنے طویل بوسوں سے بھجے سخر کر لیا۔ میرے خدا“ میں
کس قدر بے وقوف ثابت ہوا۔ میں نے اس کی خاطر پھانسی کا پھندہ مول لیا۔ شکر ہے
کہ وہ ختم ہو گیا، لیکن اگر اس کام کو مجھے دوبارہ کرنا پڑے تو ہرگز نہ کروں۔“

تمربیا جب اپنے مقتول شوہر سے متعلق گمراہ سنن بیانات سنتی ہے تو بدحواس ہی نہیں ہو
جاتی، ایک انجانے دکھ سے بھی دوچار ہوتی ہے۔ وہ کیلس سے محبت تو نہ کرتی تھی لیکن
آن دلوں میں طویل رفاقت کا ہو تعلق رہا تھا، وہ اسے بھلانے نہ بھولتا تھا اور اس پر
مستزاد، اس کے مقتول شوہر کی سمجھنی سمجھنی جیسیں تھیں، جن کی باز گشت وہ اب بھی سنتی
تھی۔

پھر ایک روز تمربیا اور لارنٹ، پہلے سے ملے شدہ پروگرام کے مطابق ایک
دوسرے کا بازو تھاے، مادام راکون کے سامنے کھڑے تھے۔ یکفت لارنٹ، مادام راکون
کی سوت مڑا۔ اس وقت اس کے چہرے کا رنگ زرد تھا اور وہ کانپتی ہوئی آواز میں گواہ
ہوا۔

”مادام، جب کیلس یافی میں گرا تھا تو اس نے چلا کر مجھ سے کما تھا۔ میری

یوں کو پچا لو، میں اب اسے تمارے حوالے کرتا ہوں۔ مجھے تھیں ہے مادام، کہ میں
تمہی سے شادی کر کے کیلیں کی آخری خواہش پوری کر رہا ہوں۔"

تمہی نے یہ الفاظ سنتے ہی لارنٹ کا بازو ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ اس کے مل پر
ایک گھونسہ سا لگا۔ لیکن اب وہ کہ بھی کیا سکتی تھی۔

شادی کے دن سخت کار کو پہنچتے ہوئے لارنٹ کی گروپ کیلیں کے کانے کا
نشان سخ ہو گیا۔ سخت کار نے پرانے زخم میں خفیف سی سوزش پیدا کر دی تھی اور یہ
کیلیں کی آخری مراجحت تھی۔

اس روز تمہیں اور لارنٹ نے محسوس کیا کہ اس صبر آزمہ وقت کے بھاؤ نے
ان کی خواہشات کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اب ان کا ماضی عائب ہو چکا تھا اور وہ اپنی شدید
جنی خواہشات کو بیٹھے تھے۔

شادی کی رات بہت سے الجھے ہوئے سوالات نے ان کے گرد گھیرا ڈال رکھا تھا۔
کیا انہوں نے ایک بے تصور کی جان نہیں لی تھی....؟ اور کیا انہوں نے ایک
بہروپ نہیں بھرا تھا کہ وہ انتہا درجے کی بے شری کے ساتھ اپنی خواہشات کی مستقل
تکمیل کا لطف اخھا سکیں....؟

دونوں سخت الجھے ہوئے تھے اور آتشِ دان کے سامنے تھکے تھکے بیٹھے تھے۔
ایسے میں دھیانِ جنسی کھیل کا یہ اختتام انہیں قطعی طور پر ایک بھیاںک اور ظالمانہ مذاق
معلوم ہو رہا تھا۔

اس روز مجلہ عروی میں منتول کی تصوری کی موجودگی نے دونوں کو بدحواس کر
 دیا، پھر یا کیا ایک ایک بیلی جانے کماں سے آئی، جو اپنے پنجے پھلانے اور کمر کو دوہرا کئے،
 انہیں مسلسل مگور رہی تھی۔

یہ شادی کی بیلی رات تھی، جس میں وہ ایک دوسرے کو چوم بھی نہ پائے اور
 اگلی راتیں اس سے بھی زیادہ کرب ہاک تھیں۔ وہ دونوں گم سم، ہر لمحہ ایک دوسرے
 کے قریب رہتے تاکہ غرق شدہ انسان کے خلاف مدافعت کر سکیں۔

لارنٹ نے خوف اور بوکھلاہٹ کے ملے جملے جذبات کے ساتھ، ایک روز
 صرف ایک کماں۔

"ہم نے اسے پانی کے سپر کر دیا۔ محض اس لئے کہ وہ ہمارے درمیان حائل تھا۔"

پھر تا دیر ان دونوں کے چھ چپ کی چادر تھی رہی۔ وہ دونوں اس بظاہر نجف و نزار بلکہ مردہ کردار کے مقابلے میں ہار گئے تھے اور نہ چاہنے کے باوجود دوہری زندگی گزار رہے تھے۔ ان میں سے ہر یک کی دو مختلف ہستیاں تھیں، ایک اعصابی اور خوف زدہ تھی، جو انہیں پڑتے ہی کاپنے لگتی تھی اور دوسری ست اور خود فراموش تھی جو سورج طلوع ہوتے ہی آزاد سائنس لینے لگتی۔

محلے کی آبادی، انہیں ایک مثالی جوڑا تصور کرتی تھی اور ان دونوں کے درمیان کیلس کی لاش حائل تھی۔

لارنٹ کی نظریں ذاتی مغاد پر رہیں، وہ سوچتا رہا کہ اگر تھریسا کو چھوڑ دیا تو ایک بار پھر مظلی سے دست و گرباں ہونا پڑے گا۔ اس کی نظروں میں مادام راکوئن کے چالیس ہزار فراکٹ تھریسا سے کہیں زیادہ اہم تھے۔ پھر اس نے موقع پاتے ہی اپنی دلی اور کچلی ہوئی خواہش پوری کی۔ ایک اسٹوڈیو خریدا اور ملازمت چھوڑ کر مصوری شروع کر دی۔

اب لارنٹ اپنی اصل سے دور ہٹ گیا تھا یا شاید یہی اس کی اصل تھی، جو قتل کے بعد ظاہر ہوئی۔ اس سے جسم تو مطمئن رہا لیکن ذہن اسے نہ دنیاوں میں لئے پھرتا رہا۔ اس کی بناتی ہوئی تصوریوں میں تازگی تھی اور نئی ایج بھی لیکن مقتول کیلس اسے صور بنا کر ایک خاص ٹائپ بن گیا تھا۔ اس کی ہر تصوری میں کیلس کے نقش در آتے اور یوں لارنٹ کے بناۓ ہوئے تمام کے تمام خاکے کیلس کے تھے۔ لارنٹ اب اس ہلاکت کا مقابلہ کر رہا تھا، جس میں اس کی فکار الگیوں نے اسے پھنسا دیا تھا۔

ایسے میں فانچ کا جملہ مادام راکوئن کو ایک نیم مردہ لاش میں بدل گیا۔ اب وہ بات کرنے سے بھی قادر تھی۔ وہ چپ چاپ ان دونوں کو بھی ری اور گوشت کے ڈھیر میں ڈھلتی گئی۔ پھر جب مادام کا ہونا اور نہ ہونا برابر ہو گیا تو لارنٹ اور تھریسا اس کی موجودگی سے بے پرواہ کر آپس میں ایسی باقاعدگی کر گزرسے، جو کیلس کے قتل کا پردہ۔

چاک کر گئیں۔ حقیقت جان کر مادام مزید بدحال ہو گئی۔ اب اس کی زندگی کی علامت دو کھلی ہوئی آنکھیں تھیں جو اول اول صہیان رہی تھیں اور اب دعات کے دو ٹکڑوں کی مانند سخت اور تاریک ہو چلی تھیں۔

اب اس گھر میں قائم زدہ مادام راکون کی موجودگی سے بے پروا لارنٹ اور تھریا، دو خطرناک دشمنوں کی طرح اکٹھے رہے تھے۔ تھریا نے انہیں ایک ہجھڑی میں جکڑ رکھا تھا۔ یوں شدید آتابہت کا شکار ہو کر جب دو دشمن ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے تو سب سے زیادہ زخم مادام راکون کو لگتے۔ وہ چپ چاپ سنت اور پھرائی ہوئی آنکھوں سے سمجھی رہتی اور کیلس کا بھوت چاروں ٹکونٹ منڈلا آ رہتا۔

تھریا اس عرصہ میں لارنٹ سے بٹ کر اپنے پیٹ کا بچہ ضائع کر بیٹھی تھی اور اب اس نے لارنٹ سے انتقام لینے کی خالی تھی۔ وہ لارنٹ سے چھپ کر پیشہ کرواتی اور اپنے اس عمل پر پھولے نہ ساتی تھی۔ یہ انوکھی محبت تھی جو انہیں ایک ایسے موڑ پر لے آئی کہ لارنٹ اس حقیقت کو جان کر بھی خوش ہی ہوا۔ تا وقت کہ ان دونوں نے ایک دوسرے کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔

لارنٹ ایک سریع الاثر زہر کی ٹلاش میں تھا اور تھریا نے اسے تیز دھار چاقو سے چمید ڈالنے کا سوچا تھا۔

ایک رات لارنٹ نے سونے سے پسلے تھریا کے لئے زہر بلا شربت تیار کیا اور تھریا نے اسے بے خبر جان کر چاقو کا دار کیا۔ یعنی اس لئے ایک عجیب احساس نے دونوں کو گھما کر رکھ دیا۔

ان دونوں نے ایک دوسرے کی نیتوں کو بجانپ لیا تھا اور اب ایک دوسرے کے سامنے تھے۔ پھر وہ دونوں تا دیر بچوں کی طرح بلک بلک کر روتے رہے۔ تیز دھار چاقو اور زہر بليے شربت کی موجودگی میں دونوں نے ایک دوسرے پر تشكیر بھری نگاہ کی۔ کچھ دیر بعد تھریا نے ہاتھ بڑھا کر زہر بليے شربت سے بھرا ہوا گلاس قمام لیا اور ایک ہی سانس میں آرھا خالی کر دیا۔ باقی شربت اس نے لارنٹ کو پیش کیا۔ جسے وہ بلا تامل پی گیا۔

یہ ان کی زندگی کی آخری رات تھی۔



ہومر : تعارفیہ

ہومر کون تھا....؟ کب پیدا ہوا اور کب وفات پائی....؟ کہاں کا رہنے والا تھا، اور اس نے کس طرح زندگی کی.....؟ نیز یہ کہ اس کا جلد تحقیقی سروایہ کس قدر ہے.....؟

ان سوالات کے جواب میں وثوق سے بات کرنا ممکن نہیں۔ ان سوالات پر صدیوں کی گرد بیٹھی ہوئی ہے۔ خود یونانیوں کو اپنے ملک الشرا ہومر سے متعلق کچھ زیادہ معلوم نہیں۔ ابھی تک تو یہی طے نہیں ہو پایا کہ ہومر نام کا کوئی شاعر تھا بھی یا نہیں۔ اس لئے بھی کہ "ہومروس" یونانی زبان میں اندھے کو کہا جاتا ہے۔

کیا ہومر واقعی اندھا تھا.....؟ اس سوال کا جواب بھی تحقیقی طلب ہے۔

یونانی زبان میں ہومر کی آنکھ سوانح عمریاں ملتی ہیں۔ جو اس وقت لکھی گئیں جب یونان کے لوگ صرف کمانی سے عی نہیں، کمانی کرنے والے سے بھی دلچسپی لینے لگے تھے۔ زیادہ تر سوانح عربوں میں ہومر کو اندھا غریب گویا بتایا گیا ہے، جو اپنا پیش پانے کی خاطر در در کی خوبکریں کھاتا پھرا۔ تماحال ہومر کی ذات سے متعلق جتنی تحقیقی ہوئی ہے وہ متضاد اور مختلف باتیں سامنے لاتی ہے۔

پہلی صدی عیسوی کا یونانی سورخ ہیرودولس لکھتا ہے کہ ہومر حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے ساڑھے آنکھ سو برس پہلے کا آدمی ہے، جب کہ دیگر سورخ میکارہویں صدی پیشتر مسیح علیہ السلام کے زمانے کو ہومر کا عمد قرار دیتے ہیں۔ ہومر کی جائے پیدائش سے متعلق بھی اختلاف ہے۔ چنانچہ ایک یونانی شاعر نے ہٹر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "سات مردہ شر ہومر کی جائے پیدائش ہونے کے دعویدار ہیں، جمال زندہ

ہومر بھیک مانگتا پھرا تھا۔"

ہومر کی کچھ سوانح عمریوں میں ہومر کو دریائے میلس کا بیٹا بنایا گیا ہے جو سرنا شر کے نیچے بتا تھا اور ہومر کی ماں ایک دریائی پری (NYMPH) تھیں گئی ہے جس کا نام کر-تھما-میں تھا۔

یونانی سورخ ہیرو ڈولس لکھتا ہے کہ یونان کے شر کیوں سے کچھ لوگ قدیم زمانے میں نقل مکانی کر کے ایشیا کے کوچک کے مغربی ساحل پر جا بے تھے۔ اس لوگوں میں ایک مغلس شخص بنتا پلوس تھا جس کی اکلوتی بینی کا نام کر-تھما-میں تھا۔ وہ ابھی بہت چھوٹی تھی کہ اس کا باپ مر گیا۔ بنتا پلوس نے مرتب وقت اپنی بینی کو کلینا کس ناہی شخص کی پرد داری میں دے دیا، لیکن کلینا کس نے ایمانداری سے کام نہ لیا اور اس بڑکی سے مل بیٹھا اور جلد ہی بدناہی کے ڈر سے کر-تھما-میں کو ایک قاتلے کے ہمراہ سرنا بھیج دیا۔ اس وقت وہ حاملہ تھی۔

سرنا میں کر-تھما-میں کا ایک بیٹا پیدا ہوا جو آگے چل کر ہومر کے نام سے مشہور ہوا۔ دریائے میلس کے کنارے ہومر نے جنم لیا تھا، اس لئے اس کا نام میلے سیگنس رکھا گیا اور بے باپ کا مشہور ہوا۔

دریائے میلس کے کنارے فمیوس ناہی ایک شاعر اور مویسیقار کا مدرس تھا۔ فمیوس نے ہومر کی ماں پر ترس کھاتے ہوئے پہلے تو اسے گھر بیو کام کاچ کے لئے طازہ رکھا اور پھر اس کی اچھی عادات سے متاثر ہو کر اس سے شادی کر لی۔ یوں ہومر کی فطری شاعرانہ صلاحیتوں کو ایک معلم کی راہنمائی مل گئی۔

فمیوس نے مرتب وقت ہومر کو اپنا وارث مقرر کیا۔ ہومر نے چند برس تک فمیوس کے مدرسے کو بڑی کامیابی کے ساتھ چلا کیا۔ یہاں تک کہ ہومر کی شرت دور دور تک بچیں گئی۔ انہی دنوں میں ایک دولت مند سیاح مینس کا دہاں سے گزر ہوا۔ مینس کو ہومر نے پہلی ہی ملاقات میں اتنا متاثر کیا کہ وہ ہومر کو سفر پر اپنے ہمراہ لے جانے پر بخند ہوا۔ مینس نے ہومر کو سفر کے فوائد بتائے اور اس کی شاعرانہ صلاحیتوں کے لئے سفر کو ضروری قرار دیا۔ یوں ہومر اس مالدار سیاح کے ساتھ مگر مگر گھوما۔

ہومر کی نظر شروع دن سے کمزور تھی۔ اس سفر کے ودران اس کی بھائی، بت

متاثر ہوئی اور "ا تمیکا" (واقع یونان) نامی شر سک آتے آتے ہومر اپنی بیٹائی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اس نے یوسف کا قصہ پہلی بار اسی شر میں سنایا تھے بعد میں اس نے اپنے روز بیچہ "اوڈیکی" کی بنیاد بنا دیا۔ ا تمیکا سے وہ سرنا کی طرف چلتا اور رات دن مخت کر کے رموز شعر پر قدرت حاصل کی۔

اب وہ انداز تھا اور اس کا کوئی ذریعہ معاش نہ تھا۔ آخر مغلی سے ٹک گ آ کر ہومر اپنے آبائی شر "کیوی" آگیا جہاں ایک زرہ ساز نے اسے اپنے گھر میں رہنے کو جگد دی۔ اب وہ اپنی نعمتیں بڑے بوڑھوں کی محفلوں میں سناتا اور انعام پاتا تھا۔ اس زمانے میں کیوی کی "شر کو نسل" میں ہومر کے مستقل ذریعہ معاش کا سوال پیش ہوا۔ کو نسل کے پیشتر میران کا یہ موقف تھا کہ ہومر کا وظیفہ مقرر کیا جائے تا کہ وہ کیوی میں رہ کر اپنی شاعری کے ذریعے اس شر کو دنیا بھر میں معروف کر دے۔ لیکن یک لفڑ ایک بدباطن شخص نے نے زور دے کر کہا "صاحب...!!" اگر کو نسل اس طرح انڈھوں کی پورش کا ذمہ لینے لگے تو وہ دن دور نہیں جب یہاں ناکارہ لوگوں کی بھیڑ لگ جائے گی۔"

الغرض شر کو نسل نے وظیفہ دینے سے محفوظ رہا اخہمار کر دیا۔

ہومر دلبڑا شہر ہو کر دہاں سے چل دیا اور ٹھوکریں کھاتا فوکیسا نامی شر میں جا پہنچا، جہاں تھوکر اندھلش نامی ایک شرت کے بھوکے شخص نے اس شرط پر اس کا روزانہ مقرر کر دیا کہ ہومر جو کچھ تخلیق کرے گا وہ تھوکر اندھلش کے نام سے مشور کیا جائے گا۔ ہومر نے مجبورا یہ کام بھی کیا۔ ایک وقت آیا جب تھوکر اندھلش نے اشعار کا کافی سرمایہ جمع کر لینے کے بعد ہومر کو گھر سے نکال باہر کیا۔ ہومر اس شر کو بھی چھوڑ کر چل دیا۔

اریتھری نامی مقام پر اس کی ملاقات ایک گھر بان سے ہوئی۔ وہ اسے اپنے آقا کے پاس لے گیا۔ مگر بان کے آقا نے ہومر کی لیاقت سے متاثر ہو کر اپنے بچوں کی تربیت کا کام اسے سونپ دیا۔ ایک بار پھر وہ بطور معلم کے مشور ہوا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اریتھری کے مقام پر قیام کے دوران اس نے شادی بھی کی، جس سے اس کی دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔

اب اس کی اگلی خزل ایجمنٹر تھی۔ وہ ایک بڑے شر سے اپنی آواز ساری دنیا

تک پنچاہا چاہتا تھا۔ ایخنر جاتے ہوئے ساموس کے جزیرے میں اس کی بہت قدر افرانی ہوئی اور انعامات سے نوازا گیا۔ موسم بارہ میں وہ ایخنر پنجنے سے پہلے جزیرہ یوس میں سخت بیمار ہو گیا اور وہیں وفات پائی۔ ایخنر، جزیرہ یوس اور ارکیدیا کے چڑواہے اس کی تربت پر مستقل حاضری دیتے ہیں۔

مشور یونانی فلاسفہ ارسطو سے منسوب ایک کتاب میں ہومر سے متعلق ایک روایت درج ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ وہ ارکیدیا کے سندھ کے کنارے ماہی گیروں کی آبادی میں گیا اور سوال کیا کہ۔

”اے ارکیدیا کے ماہی گیرو.....!! کیا تمارے پاس کچھ ہے.....؟“

اس کے جواب میں انہوں نے ایک پیلی کھی۔

”جو کچھ ہم نے پکڑا تھا، سو پیچھے چھوٹ گیا۔ جو ہم نے نہیں پکڑا، وہی ہمارے

پاس ہے۔“

کہا جاتا ہے کہ ہومر اس پیلی کو نہ بوجھ سکا اور اسی غم میں مر گیا۔ ہومر سے بتی نہیں منسوب ہیں۔ لیکن دو ثقہ سے نہیں کہا جاتا کہ وہ تمام نہیں ہومر کی ہیں بھی یا نہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کی بہت سی نہیں ہم ہو گئیں، جن میں سے ایک مزاحیہ رزمیہ مارجیٹس (MARGITES) کا ذکر ارسطو نے کیا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہومر کی تمام تر شہرت اس کی دو طویل نہیں (رمیوں) ”اوڈیسی“ اور ”ایلیڈ“ کے سبب ہے۔

رمیہ ”ایلیڈ“ میں ہرائے کی جنگ کا بیان ہے جو اہل یونان اور ہرائے شر والوں کے مابین ہوئی۔ اس دو سالہ جنگ میں طرفین کے بڑے نہیں دلیر مارے گئے۔ اس ہرائے کا اصل سبب کیا تھا.....؟ دوسرے اس کی کیا صورت رہی اور آخر کار اس کا خاتمه کیوں گھر ہوا.....؟

ان سوالات کا جواب جانتے کے لئے ہمیں ”ایلیڈ“ کے ساتھ دوسری کتابوں سے بھی مدد لینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ البتہ جن لوگوں کے سامنے ہومر نے ان قصوں کو ہما کر سنایا ہو گا وہ یقیناً اس جنگ کی اصل حقیقت سے وافق ہوں گے، یا کم از کم ۵۵۰ قبل مسح میں ایخنر کے لوگ اس واقعہ سے بخوبی آگاہ رہے ہوں گے۔

"ایلیڈ" میں ژائے کی جس جگ کو ہومر نے اپنا موضوع بنا ہے اس کے بارے میں آثار قدیمہ کے ماہرین کا خیال ہے کہ وہ ۱۳۰۰ قبل مسح کا قصہ ہے۔ یہ جگ ہوتی ضرور حقیقی گو اصل واقعات اور وجہ وہ نہ ہوں جو ہومر نے بیان کی ہیں۔ البتہ ہومر کی راہنمائی سے جو حقیقی کے ایک ماہر آثار قدیمہ نے ۱۸۷۸ء میں ژائے شر کو کھو دیا۔

دوسری نظم (رزیمہ) "اوڈیسی" کا قصہ اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب شر ژائے کو تباہ ہوئے ہیں برس گز رچکے تھے۔ یوں "اوڈیسی" کا تعلق تاریخ سے نہیں ہومر کے تخیل سے ہے۔ اس نظم میں یوں یہی ایک اوالحزم ہادشاہ کا ذکر خاص ہے جو ژائے کی جگ میں شریک تھا۔ اس نظم میں تباہا گیا ہے کہ گھر کی طرف واپسی کے دوران کس طرح طوفان نے اس کے بھری بیڑے کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا اور وہ کس طرح ملک ملک پھرتا آخر کار اپنے وطن پہنچا۔

"ایلیڈ" اور "اوڈیسی" کی زبان و بیان میں خاصا فرق پایا جاتا ہے اس لئے اس بات پر بھی بیشہ سے بحث ہوتی آئی ہے کہ یہ دونوں نظمیں (رزیمے) ہومر کی تخلیقات ہیں بھی یا نہیں۔

قدم و قدم سے ایک نظریہ یہ بھی رہا ہے کہ "اوڈیسی" کسی عورت کی تصنیف ہے۔ آج تک اس نظریے کے سب سے بڑے حاوی مشہور انگریزی شاعر اور محقق رابرت گریوز ہیں۔ رابرٹ گریوز (R.GRAVES) نے اپنی دو کتابوں "HOMER S DAUGHTER" اور "THE GREEK MYTHS" میں کچھ دلائل بھی پیش کئے ہیں لیکن ان کے خیالات کو بھی حقیقی سمجھنا غلط ہو گا، اس لئے کہ اب تو ان دلائل کے رو میں بھی کئی مفاسدیں لکھے جا پچکے ہیں۔

۲

بارہ سو سال قبل مسح میں اہل یونان اور اہل ژائے کے مابین ہونے والی خوزیری جگ "اوڈیسی" کا پس مظہر ہے۔ اس جگ کی تفصیل ہومر نے اپنے مشہور رزیمہ "ایلیڈ" میں بیان کی ہے، جس سے پتا چلا ہے کہ "ژائے" ایشیائے کوچک میں عظیم

الشان سلطنت تھی، جس کا بادشاہ پریام ایک جانباز مرد تھا۔ پریام کے چھوٹے بیٹے پارس نے سپارٹا (یونان) کے سردار مینیاؤس نے یونان کے تمام سرداروں کو جمع کر کے اپنی بے عزتی کا بدله لینے میں مدد چاہی۔ جس کے نتیجے میں یونان کے بڑے بڑے جنگجو سرداروں نے اپنے اپنے لفڑی کے ساتھ بھری بیڑے کے ذریعے ژائے پر چڑھائی کی۔ اس حملہ میں اینکا (یونان) کا عظیم جنگجو سردار اوڈسیوس (ایوس) بھی شریک ہوا اور ژائے کی جنگ میں عظیم جنگی ہیرو ایجنٹس اور اکلیس کے شانہ بٹانہ کا رہائے نمایاں انعام دیئے۔ جنگ ختم ہونے کے بعد جو یونانی سردار زندہ بچے وہ اپنے اپنے ملکوں کو واپس ہو لئے، مگر اوڈسیوس دیوتاؤں کی ناراضگی کے سبب طویل دست تک مارا مارا پھرتا رہا۔ "اوڈسی" میں اس کی اس طویل سافرت کا احوال بیان کیا گیا ہے۔

"ایلید" اور "اوڈسی" اہل یونان کے لئے باسل کا درجہ رکھتی ہیں۔ قدیم تفتریں میں ہر چار سال بعد ایک بڑا میلہ لگتا تھا، جس میں بادشاہ وقت ان دونوں رزمیوں کا ایجاد کرتا تھا۔ ہر اس یونانی تنقیب کا ریکارڈ کپر ہے، جو ۲۳۰ قبائل مسح میں فتح ہستی سے تابود ہو گئی۔ "ایلید" اور "اوڈسی" یونانی شاعری کے قدیم ترین نمونوں سے ہیں جن کے زمانہ تحریر کا تھیں نہایت درجہ مشکل ہے۔

ان دونوں رزمیوں کو قدیم محققین نے ۱۰۰۰ قبائل مسح کی تخلیقات بتایا ہے، جب کہ چدید ترین تحقیقین انسیں ۸۰۰ قبائل مسح کی تخلیق بتاتی ہے۔ چدید ماہرین لسانیات نے دمر کی زبان، صرف و نحو اور روزمرہ پر تحقیق کر کے اس کے حقیقی عمد کی نشاندہی کرنا چاہی تو پا چلا کہ ہرمنے اپنے زمانے کی زبان لکھی ہی نہیں۔ اس نے مختلف علاقوں پر بیان کرتے ہوئے مختلف زمانوں کی یونانی زبان کو بردا۔ اس طرح اس کے اصل عمد تک پہنچنا دشوار ہے۔ جہاں تک روزمرہ استعمال کی چیزوں، ربوم و رواج اور اصطلاح کے بیان کا تعلق ہے تو اس سے کبھی محققین غور کوئی خاص مذہبیں ملتی۔ اس لئے کہ ہرمنے اپنے عمد سے پہنچنے بہت کر تقریباً چار سو برس پہلے کے واقعات اور کرواروں کو اپنے قصے کے لئے چتا۔ ژائے کی جنگ ۲۰۰ قبائل مسح کا حصہ ہے، جس کا بیان "ایلید" میں ہوا جب کہ "اوڈسی" میں ژائے کی جنگ کے میں برس بعد کے زمانے کو پیش کیا گیا۔

ستہ تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ ۵۵۰ قبل مسح میں یونان مختلف ریاستوں میں بنا ہوا تھا اور اس پر مختلف حکمرانوں کی حکومت تھی۔ اتحدیز کا حاکم ہنتر اتوں تھا۔ اس نے "پان آقینی" نامی ایک قوی تیوار کو رواج دیا۔ تیوار میں خواص و عام، ایک بڑا جلوس ایتمہنی دیوبی کے مندر تک پیدل چل کر جاتا تھا اور دہاں ہو مر کے منظوم تھے، روزے کو سرپل آوازوں میں پڑھ کر سنایا جاتا تھا۔ ان دنوں ہومر کے منظوم تھے نگنوں کی صورت میں ملتے تھے۔ لیکن گاکر سنانے والے ان قصوں کی باہمی ترتیب اور ربط کا خیال نہیں رکھتے تھے۔ شاہ ہنتر اتوں کے حکم خاص پر ۵۵۰ قبل مسح میں ہومر کی نظموں کا ایک سرکاری متن قلم بند کیا گیا، یوں ہومر کا کلام شائع ہونے سے فوج گیا۔

۱۵۰ قبل مسح کے لگ بھگ ہومر کی دو طویل نظموں یعنی "ایلید" اور "اوڈیسی" کو کتب خانہ اسکندریہ کے ناظم ارستاد خوس نے نامور تاریخ دانوں اور محققین کی مدد سے مرتب کیا۔

"ایلید" اور "اوڈیسی" کے تراجم دنیا کی تقریباً تمام بڑی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ اردو میں "ایلید" اور "اوڈیسی" کا اولین تعارف ہنگاب ریجنس بک سوسائٹی ایار کی لاهور (پاکستان) نے ۱۹۲۲ء میں "ایلید و اوڈیسے" کے نام سے خلاصے کی صورت میں پیش کیا تھا۔ جب کہ اردو میں "اوڈیسی" کا پہلا اور تما حال آخری مطبوعہ ترجمہ محمد سعید الرحمن نے "جمال گرد کی واپسی" کے نام سے نشر میں کیا ہے، جسے مکتبہ جدید لاهور (پاکستان) نے ۱۹۶۳ء میں شائع کیا۔ یاد رہے کہ "اوڈیسی" کا ایک ترجمہ ڈاکٹر پروین نے بھی کیا تھا جو تماحال کتابی صورت میں شائع نہیں ہو سکا۔ "ایلید" اور "اوڈیسی" کا کوئی مخصوص نیایی اور نامی پس منظر نہیں ہے۔ دو رزمیوں کی صورت اس منظوم تھے میں ۸۰۰ تا ۱۰۰۰ قبل مسح کے یونانی مطلق العنان پادشاہوں کے اہل ڑائے پر غلبہ پانے کے بعد واپسی کا سفر بیان کیا گیا ہے۔

"ایلید" اور "اوڈیسی" کا مرکزی گدار اوڈیسوس غلطی سے سندر کے دیوتا کے بیٹے کی بیٹائی زائل کر دیتا ہے، جس کے سب اسے طبع طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس منظوم تھے روزیہ میں ہومر نے خصوصیت کے ساتھ جوان ہمت اوڈیسوس

کی محبت، دوستی اور دلتن پرستی کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ جب کہ عالم بالا پر دیوتاؤں کو انسانی مقدار کے فیضے کرتے بھی دکھایا گیا ہے۔

اوڈسیوس سورماؤں کے دور کی یاد تازہ کر رہا ہے۔ انسانی "حافظے" میں سب سے قدیم یادیں اسی نہم تاریخی دور (سورماؤں کا دور) سے متعلق محفوظ ہیں۔ جب انسان نے تاریخ لکھنے شروع نہیں کی تھی۔ اس وقت انسان اپنی ہی طرح کے (لیکن طاقتوں اور پاکال انسانوں کو) "دیوتا" یا "دیوتاؤں کا اوتار" سمجھتا تھا۔ اوڈسیوس مردانہ وجاہت کا بیکر، مذیر اور تکوائر کا دھنی ہونے کے ساتھ سیاح اور قصہ گو بھی ہے۔ وہ دیوتاؤں کا تابع فرمان، دوستوں کا دوست، خالموں کا دشمن، یہوی بچوں سے محبت کرنے والا دلتن پرست انسان ہے۔ ہومر نے اوڈسیوس کے حوالے سے قافی انسان کی جدوجہد اور تندیسی درثی کی تلاش کو بنیادی اہمیت دی ہے۔ اس منحوم قصے، رزمیہ میں ہومر نے سفر کو وسیطہ قصر قرار دیا ہے۔ ہومر نے اوڈسیوس کے سفر کا احوال بیان کرتے ہوئے ہمیں اس دنیا کی ہیئتیوں سے متعارف کرنے کے ساتھ ساتھ تخیل اور رومان کی دنیاؤں کی سیر بھی کروائی ہے۔ یوں ہم ایک سے زائد تنبیہوں اور رسوم و رواج سے آشناً حاصل کرتے ہیں۔

مجموعی اعتبار سے اینکا کی ملکہ یعنی اوڈسیوس کی یہوی پینے لوپیا اور اس کے عشقاء کے حوالے سے قدیم یوپیان کی سیاسی اور سماجی رسومات سے واقفیت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ہمیں عالم بالا پر زیوس دیوتا کے دربار کی "دیوتا کونسل" سے متعلق بھی معلومات ہاتھ آتی ہیں جس سے پتا چلتا ہے کہ دیوبیان اور دیوتاکس قدر ضدی "خود سر اور کم زور کبار کے حامل ہیں۔ "اوڈسی" میں ہومر نے ہمیں ساگھون اور لکھوپیس اقوام کی طرز معاشرت کے ساتھ ساتھ راس طیا، جزیرہ لاموس، سورج دیوتا کے مثلث "نمای خیالی جزیرے، جزیرہ ہوگی کیا اور جزیرہ فیا کیا کے علاوہ پاتمال سے متعلق معلومات فراہم کی ہیں۔

اس طرح ہم کہ سکتے ہیں کہ ہومر نے اس وقت کی معلومہ دنیا اور دوسرے جہاں میں روحوں کی حالت سے متعارف کرانے کے ساتھ جزا اور سزا کے تصور پر بھی فیال آرائی کی ہے۔

ہومر کی شاعری سے ہم لوگ ناداتف سی، تاہم اس کے نام سے ضرور واقف ہیں۔ جب کہ یورپ میں ہومر کی تعارف کا محتاج نہیں۔ بلاشبہ اسے یورپ کے نعم

نگار شراء کا استاد کما جا سکتا ہے۔ قدیم یونان میں مشور قانون داں لائی کر گئی اور سولون اس کی نظموں کے تکوئے گیوں سے فرمائش کر کے ناکرتے تھے۔ کما جاتا ہے کہ عظیم یونانی فلاسفہ ارسطو نے اپنے شاگرد عنز سخندر اعظم کے لئے ہومر کی ان دو نظموں کے محتوا نئے ایک جلد میں تیار کروائے تھے۔ سخندر اعظم اس کتاب کو جزو جزو داں میں پہنچ کر اپنے بھیج کے پہنچ رکھتا تھا۔

ہومر کی نظمیں نہ صرف نظم کی شاعری میں اعلا مقام کی حاصل ہیں بلکہ یونان کی قدیم تاریخ اور نب ناموں کا مخزن سمجھی جاتی ہیں۔ جس طرح ایران کے شاعر حافظ کے دیوان سے ہمارے ہاں لوگ قال نکالتے ہیں ’ای طرح ”ایلیڈ“ اور ”اوڈیسی“ میں سے اہل یونان قال نکال کر قصت کا احوال جانتے کی کوشش کرتے تھے۔

یونان اور سارے یورپ کے شاعر ہومر کی رسمیں بیانی پر سردھنے تھے اور فلاسفہ اس شاعری میں سے قلمیانہ سائل خلاش کرتے تھے۔ یورپ کے مذہبی محقق اور شارحین، خاص طور پر صوفی مسلم کے لوگوں نے ہومر کے بیان کردہ قصوں کو روحاںی وارداتیں سمجھ کر ان کی تشریع میں کئی سوتاہیں لکھیں۔

ہمارے ہاں کے تعلیم یافت لوگ ہومر کے نام سے واقف ہیں۔ اگرچہ اس کی شاعری بہت کم لوگوں کی نظر سے گزری ہے۔ فارسی شاعر فردوسی اور سکرت شاعر والیک کا ذکر کرتے ہوئے ہمارے ہاں اکثر کما جاتا ہے یہ دونوں فارسی اور سکرت کے ہومر ہیں۔ یوں ہم اپنے شاعروں کی اہمیت بڑھاتے ہیں۔ الفرض جس قدر شہرت اور مقبولت ہومر کو حاصل ہوئی ہے شاید یہ کسی دوسرے شاعر کے حصے میں آئی ہو۔ یوں ہم کہ سکتے ہیں کہ اگر کوئی شاعر ساری دنیا کا ملک الشراء کلانے کا مستحق ہے تو وہ صرف ہومر ہے۔

ہومر نے اپنے رزمیہ کے گواروں کے ذریعے یونان کے عظیم سورماؤں کا تعارف اس طرح کروایا ہے کہ جن لوگوں نے بھی اس کے اشعار پڑھے ان کے دل میں اکلیس (ACHILLES) ہیکٹر (HECTOR) اور اوڈسیوس بننے کی اولوالہمنہ خواہش پیدا ہوئی۔

؛ اکثر اطہر پرور ز لکھتے ہیں۔

"جہاں تک ادب کا تعلق ہے، یونانی ادب کی دو بڑی خصوصیات ہیں۔ سچائی اور سادگی۔ ایسا نہیں ہے کہ یونانیوں نے دوسروں کے مقابلے میں کم اہتمام رکھا ہے ہیں، کم جھوٹ بولتا ہے، بلکہ ثابیہ اور وہ سے زیادہ ہے۔ لیکن چونکہ مخفی سے خوب ہتھے اس لئے ان کے اہتمام میں، ان کے جھوٹ میں زندگی کی بڑی سچائیاں ہیں۔ انہوں نے دنیا کو اس طرح دیکھنے کی کوشش کی ہے جیسی کہ وہ ہے۔ اس میں ان کے فلسفے اور سائنس دنوں نے مدد کی۔ ان کے شاعروں نے دنیا دیکھی اور انہوں کو سمجھا اور یہ تھا۔ کیونکہ وہ انسانی زندگی کو اس کے صحیح ناظر میں دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے بیان بچوں کی ہی اثر پذیری ہے، لیکن ان کے ذہن میں بند درستی بڑوں کی طرح کھلتے ہوئے ہیں۔" یوں محبت، دوستی، وطن پرستی اور اپنے آپ کو کسی عظیم مقصد کے لئے وقف کر دینے میں جو حسن اور صداقت ہے، وہ ہومر کے غیر فانی کرداروں میں پوری طرح ہے نقاب ہو گئی ہے۔ یقینی بات ہے کہ ان عظیم اور محبوب کرداروں کے ساتھ قاری کی رفاقت کا جو احساس پیدا ہوتا ہے، اس سے ان کے جذبات میں نقاصل اور وسعت آ جاتی ہے۔ البتہ تمام کرداروں کو ہم اخلاقی سطح پر قابل تحقیق نہ نہیں کہ سکتے۔

ہومر نے اپنے عصر کی برائیوں خصوصاً زیوتاؤں کی بے جا پرستش کی ذمہ دکھنے کی
ہے۔ اس نے زیوتاؤں کے گھناؤنے کردار پیش کر کے انسان کو "نیم زیوتا" یا "زیوتا" کے درجے سے بلند کرنے کی کوشش کی ہے۔ یوں ہومر کو قدیم عمد کے دیگر شعراء پر اس حوالے سے نوقیت دی جا سکتی ہے کہ اس نے انسانی فطرت سے پھوٹنے والے خیالات و احساسات کو خوبی سے پیش کیا ہے۔

ہومر عظیم شاعرانہ صلاحیت کے ساتھ ساتھ گھرے تنقیدی شعور کا مالک بھی تھا۔ "ایلینڈ" میں پائے جانے والے تنقیدی افکار دنیا بھر کی تنقید کے اوپر نہ نہیں کہے جا سکتے ہیں جن پر بعد کے نادین نے اضافے کئے۔ مثال کے طور پر

۱ ہومر شاعری کو الہامی قوت قرار دتا ہے اور اسے زیوتاؤں سے منسوب

کرتا ہے۔

۲ اس کے نزدیک شاعری کا مقصد "سرت" فراہم کرتا ہے۔

۳ ہومر کی نظریوں سے فریب نظر (ILLUSION) کے عصر کی اہمیت

واضح ہوتی ہے۔

- ۳ ہومر کے مطابق تخلیقی محل ویلے (MEDIUM) کی تحریر کرتا ہے۔
- ۵ ہومر کے خیال میں شاعر اور موسیقار شعر کی دیوی کے چیتے ہیں۔ اُنہیں بھارت سے محروم کر کے شعر کی دیوی سریلے نغمات بخش دیتی ہے۔

ہومر کے شاعری کے نظریے اور شاعری کے اثر کے تحت یونان میں مختلف اضاف تھن نے فروغ پایا۔ خصوصاً گیت کی صفت پیدا ہوئی، جس کی کوکھ سے اور (ODE) نے جنم لیا اور "کورس گیت" وجود میں آئے۔ ہومر کے تخلیل اور نظر نے یونان اور اس کے بعد پورے یورپ میں علوم و فنون کے میدانوں کو متاثر کیا۔ یوں یورپ نے وہ کارناٹے انجام دیئے جو آج انسانیت کی معراج ہیں۔ خاص طور پر نشاة ٹانی کے زمانے میں یونانی ادب اور یونانی فلسفیوں کے نظریات کا یورپ نے براہ راست اثر قبول کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ترکوں نے یونانیوں کو تخت دی اور اس کے نتیجہ میں یونانی یورپ میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ اس زمانے میں یونانیز کے ایک ہم عصر شاعر چیپ میں نے ہومر کو ترجمہ کر کے اسے یورپ سے متعارف کروا دیا۔ اس دور میں یونانی رزمیوں خصوصاً "ایلیڈ" اور "اوڈسی" کا اثر یورپی ڈراموں اور داستانوں میں بہت نمایاں ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ یورپی ادب میں جس قدر حوالے یونانی اساطیر کے ملتے ہیں وہ سب کے سب ہومر کی شاعری سے مستعار ہیں۔

اب یورپی اور امریکی ادب پر ہومر کے براہ راست اثرات کی چند مثالیں دیکھئے۔

- ۱ انگریزی شاعری کے بد ابجد چاہرہ کی مشہور نظم "TROILUS AND CRESÈDE" ہومر کی نظم "ایلیڈ" سے متاثر ہو کر لکھی گئی۔
- ۲ نئی سن کی اہم ترین نظم "یولی سس" کا بنیادی خیال "اوڈسی" سے ماخوذ ہے۔ خصوصاً "لوٹس" کے پھول کھانے والے کردار تو ہیں ہی ہومر کی اختراع۔
- ۳ کیکھ نے ایک سانیسٹ چیپ میں والے ترجمے کو پڑھ کر لکھی۔ اس سانیسٹ پر کیکھ نے ہومر اور چیپ میں کا حوالہ بھی دیا ہے۔
- ۴ بنگز جوانی کی ناول "یولی سس" کا بنیادی خیال "اوڈسی" سے ماخوذ ہے۔

۵ ہنری جنر (امریکہ) نے ۱۸۹۵ء تا ۱۹۰۰ء تک ہومر کے اثرات کے تحت تحریر آمیز کمپنیاں تھیں۔

۶ ہرمن میلول (امریکہ) کا ناول "موبی ڈک" سندروں کی مسمی جوئی سے متعلق ہے۔ "موبی ڈک" میں انسان کا دلیل چھٹلی سے مقابلہ کرنا، ہمت اور ضبط سے مایوس اور محرومی پر غلبہ پانا، اوڈسیوس کے سندروی سفر کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔

۷ نوبل انعام یافتہ ناول نگار ارنست همینگوے (امریکہ) نے اپنی مشہور زمانہ ناول "بوڑھا اور سندر" میں اوڈسیوس اور غصبتاک سندر کی علامت استعمال کی ہے۔

ایک موقع پر بوڑھا اپنی جوانی کے ہیرو کا ذکر کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ ہیرو بیس بال کھیلتا تھا لیکن اس کی ایڑی خراب ہو گئی۔ یہ "ناکارہ ایڑی" کی علامت بھی ہومر سے مستعار ہے۔ ہومر کا جگلی ہیرو اکلیس جب بیکٹر کو قتل کر دینے کے بعد اس کی لاش کو اپنی رتح سے باندھ کر ٹرائے کے گرد فاتحانہ چکر لگانا ہے تو اپالو کا بینا پرس اکلیس کے دشمنوں کو مشورہ دیتا ہے کہ "اکلیس کی ایڑی پر تحریر مارو" وہ ناکارہ ہو جائے گا۔

ای طرح "ایلینڈ" اور "اوڈسی" میں سندر تقدیر کی علامت ہے۔ "بوڑھا اور سندر" از همینگوے میں بھی یہ علامت انہی معنوں میں استعمال ہوئی ہے۔

۸ یورپ اور امریکہ کے ادب میں "ژوجن ہارس" (لگڑی کا گھوڑا) کی علامت (بکوالہ ایلینڈ) ہومر کی اختراع ہے۔ اوڈسیوس ٹرائے کے قلعہ کو فتح یہ ژوجن ہارس کے ذریعے کرتا ہے۔

۹ یورپ اور امریکہ کے ادب میں "ژوجن ہارس" سے متعلق کمی محاورے ملتے ہیں۔ بظاہر کچھ اور درحقیقت کچھ کے معنوں کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔

۱۰ ہومر کی "اوڈسی" کا ایک آنکھ والا آدم خور عالمی ادب میں ایک زندہ کردار بن گیا۔ خود اردو کی پیشتر داستانوں اور حکایتوں میں ایک آنکھ والا دیوبھٹا ہے۔ یہ الگ تھہ ہے کہ ہومر نے اکیائی تہذیب کو سر بلند کرنے کی خاطری یہ کردار تراشنا۔

۱۱ "اوڈسی" میں سر سے کا ایک خیالی جزیرہ ہومر کی تخلیق ہے۔ آج کے یورپی ادب میں "سر سے کا جزیرہ" ایک علامت کے طور پر ملتا ہے۔

۱۱ انسان کو "ناانسان" میں بدلتے پر قادر بدی کی طاقت کی علامت عالی ادب میں پائی جاتی ہے جو درحقیقت "اوڈسی" کی کرکی جادوگرنی سے ماخوذ ہے۔

۱۲ اوڈسیوس کی بیوی پیٹنے لہیا کا انتظار عالی ادب میں خاوند کے ساتھ وقاشعاری کی ایک علامت بن چکا ہے۔

۱۳ اپین کے داستان طراز سرواقش کا "وان کیجتے" مرکزی کردار کی سطح پر اوڈسیوس سے خاص مشابہت رکھتا ہے۔

۱۴ یورپ اور امریکہ میں "اوڈسی" کے خیال کو بنیاد بنا کر بچوں اور بڑوں کے لئے لاتھدار فچر قلمیں بنیں۔ جن میں سے WESSEX لندن غمز کی

(۱۹۵۰) "THE WOODEN HORSE"

بالی وڈ امریکہ کی "HELEN OF TROY" (۱۹۵۶)

اور M . G . M امریکہ کی "20001 A SPACE ODYSSEY" (۱۹۶۸) خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱۵ ڈاکٹر وزیر آغا کے مطابق "ایلینڈ" میں سات الفاظ کی تحرار ہوئی ہے -
KER 'KARDIE 'PSYCHI 'NOOS 'PHRENES 'THUMOS
"ETOR۔ ان الفاظ میں سے پہلے چار الفاظ کا مفہوم "روح" ہے (جب کہ "NOOS" اور نفس کی صوتی مماثلت بھی قابل غور ہے) اور باقی تین یعنی KER 'KARDIE اور ETOR کا مفہوم "دل" ہے۔ گویا "ایلینڈ" میں روح اور جسم کی وہ شوہت پہلی بار اجاگر ہوئی جو بعد ازاں مغربی فلسفے کا بنیادی عازم قرار پائی۔

جو لیں جیز نے روح اور جسم کی اس شوہت کے ظہور کے واقعہ کو دیکھ تاؤں کی دنیا کے مقابلے میں انسانوں کی دنیا کے ظہور کا عظیم واقعہ قرار دیا ہے۔ یعنی "ایلینڈ" میں انسان کی تدبیم BICAMERAL MIND کے خونے اور شعور (CONSCIOUSNESS) کے وجود میں آنے کا مظرا بساں دیکھا جا سکتا ہے، نیز گذشتہ اڑھائی ہزار برس کے مغربی افکار پر روح اور جسم کی اس شوہت کا مطالعہ خاص طور پر تیجہ خیز ثابت ہو سکتا ہے۔

اب آئیے شرقی، ہندوستانی ادبیات کی طرف۔

کا بقول ڈاکٹر وزیر آغا، ہومر کی "ایلینڈ" اور "اوڈیسی" کے ساتھ "ہما بھارت" اور "رامائن" کا تقابلی جائزہ خصوصی توجہ کا طلب گار ہے مثال کے طور پر اوڈیسوس "ایلینڈ" کا اہم ترین جگجو بھی ہے اور "اوڈیسی" کا مرکزی کردار بھی یعنی ایک ہی کردار دو نوں رزمیوں کو ایک بنیادی تاریخی طرح پرداز ہے۔ بالکل اسی طرح رامائن کی کمائی اختصار کے ساتھ "ہما بھارت" میں بھی موجود ہے۔ اسی طرح PERSED کا کردار ارجمن سے مشابہ ہے اور HESOID کی طرح کرشن مہاراج، ارجمن کو دنیا جان کے معاملات سے متعلق اپدیش دیتے ہیں۔ چونکہ کرشن مہاراج دیوتا ہیں اس لئے اس بات کے امکان کو مسترد کرنا مشکل ہے کہ HESOID کی حیثیت بھی ہومر کے ہاں کم و بیش ایک دیوتا کی ہی ہے یا کم ازا کم دیوتاؤں کی اس آواز کی ہی ہے جو اس نامے کے حساس افراد کو اپنے بلوں سے ستائی دیتی تھی۔ اسی طرح ہیلن آف ڑائے، جس کا اغوا ہومر کے ان دو عظیم رزمیوں کی تخلیق کا سبب بنا، سیتا سے مشابہ ہے۔ ہیلن کو پارس نے اخوا کر لیا اور سیتا کو راون نے۔ ہیلن کی بانیابی کے لئے ڑائے کی جگہ لڑی گئی اور سیتا کے لئے لکھا پر چڑھائی کی گئی۔

اوڈیسوس کی یہوی پیٹنے لوپیا کی وفا شعراوی سیتا کی مثالی وفا شعراوی سے مماثل ہے، اسی طرح اوڈیسوس کی صم جوئی رام کے خود اختیاری بن باس سے ملتی جلتی ہے۔ لاموس اور سر سے کے جیاز لکھا کے جزیرے سے مشابہ ہیں جب کہ ساگھون اور سائیکلوبیں قوم سے ہنوان دیوتا اور اس کی بندروں قوم کی طرف خیال جاتا ہے۔ یہ الگ قصہ ہے کہ خیر اور شر میں سے چھاؤ کرتے وقت سائیکلوبیں شر کا چھاؤ کرتے ہیں اور ہنوان خیر کا۔

بہت ممکن ہے کہ ہندستانی "رمیوں" بالخصوص، رامائن پر "ایلینڈ" اور "اوڈیسی" کے اڑات مردم ہوئے ہوں۔ یہ قیاس اس لئے بھی کیا جا سکتا ہے کہ چوتھی صدی قبل مسیح میں یونانیوں نے ہندوستان پر حملہ کیا اور کافرستان وغیرہ کے بعض مقامات پر مستقل رہائش اختیار کی، جس کے نتیجہ کے طور پر گندھارا آرٹ کو فروغ ملا۔ یوں اگر آرٹ کی سلسلہ پر ہم نے یونانی اڑات قبول کئے تو ادب کی سلسلہ پر ان اڑات سے بکر اثار ممکن نہیں۔

دوسرا طرف "اوڈسی" "اے بیلیڈ" کے بہت بعد کی تخلیق ہے (یہاں تک کہ اسلوب میں بھی صاف فرق کیا جا سکتا ہے) کیسے ایسا تو نہیں کہ "رامائش" نے "اوڈسی" پر اڑات مرکم کئے ہوں۔

۱۸ اردو ادب میں پہنچت رتن نامہ سرشار کے "فانہ آزاد" کا ہمرو آزاد براہ راست تو نہیں البتہ سروال خس کے "ذان کھوتے" کے زیر اثر ہالواسط ہومر کے اوڈسیوس سے مشابہ ہے۔

۱۹ جعفر طاہر کے اردو کٹوڑ مشمول "ہفت کشور" پر ہومر کی "اے بیلیڈ" اور "اوڈسی" کی کہانی کے اڑات بہت واضح ہیں۔

۲۰ ہماری داستانوں میں کرکی جادوگرنی اور ایک آنکھ والے دیج سے مشاہت رکھنے والے کروار ہمت بڑی تعداد میں ملتے ہیں۔ اسی طرح ہماری داستانوں میں سفر کو دیلہ ظفر قرار دینا اور نیک مقصد کے حصول کی خاطر سبر اور ہمت کا مظاہرہ کرنا، نیز انتصیب دیوبی کی طرح مد گار کرداروں کی موجودگی کو ہم ہومر کا براہ راست اثر تو نہیں کہ سکتے البتہ دیگر زبانوں خصوصاً فارسی اور عربی کی معروفت ہومر کے یہ اڑات اردو ادب نے بھی قبول کئے ہیں۔ ان مثالوں کو دیکھتے ہوئے کلاسیک کی خواہ کوئی بھی تعریف کی جائے "اے بیلیڈ" اور "اوڈسی" کو کلاسیک مانا پڑتا ہے۔ بقول ارنست اوہوزر۔

"صدیاں بیت گئیں" یا ر لوگ ابھی تک اوڈسیوس کی راہوں کو کریدنے میں مصروف ہیں اور آج کا سیاح اپنے گائیڈ کی زبانی سائیکلوپس اور سائیرس چنانوں کا ذکر سن کر صدیوں پیچھے دفن ماضی میں کھو جاتا ہے۔"

مرزا حامد بیگ

ہومر، حمزہ خاں میگ

اوُقیٰسی

تمہیرہ:

یونان کے خوب صورت علاقتے سپارٹا میں خذاریوس کی عمرانی تھی۔ اس کی ملکہ کا نام یزدا تھا، جس کے بیٹن سے اس کے چار ^{ہر زندہ پیدا ہو سے۔} بے کے سب خلف شوہر میں نامور ہوئے۔ کنٹور اپنے زانے کا بڑا شہ سوار تھا اور پولینڈ، گھونسہ بازی میں لاثانی۔ بڑی بیٹی کلیم نسٹر! کی شادی شاہ اگمنون سے ہوئی، جس کی عمل داری میں یونان کا بیشتر حصہ تھا۔ چھوٹی بیٹی بیلن تھی، جس کے حسن و جمال کا شہرہ تھا اور یونان کے تمام شہزادے اس پر فدا۔

بیلن کی شادی کے سلطے میں سپارٹا کے شاہ خذاریوس کو سخت مشکل کا سامنا تھا۔ بالآخر اسے ایک ترکیب سوجی۔ اس نے بیلن کے جلد ہاتھے والوں کو بکھا کر کے یہ عمد لیا کہ بیلن جسے ہا ہے پسند کر لے۔ نہ صرف یہ کہ مسترد کر دیجے جانے والے کوئی مزاحمت نہ کریں گے بلکہ یہ بھی کہ اگر کوئی شخص بیلن کو اس کے شوہر سے چھین لے جائے تو بے کے سب اس کی ہازیافت کے لئے مل کر کوشش کریں گے۔

بیلن کو اپنے شوہر کے اختیار کا اختیار ملا تو اس نے اپنے بہنوئی شاہ اگمنون کے چھوٹے بھائی مینیاوس کو اپنے شریک حیات ہن لیا۔ یوں سپارٹا کے شاہ خذاریوس نے اپنی چھوٹی بیٹی بیلن کی شادی کے بعد اپنی سلطنت داماد مینیاوس کے حوالے کر دی اور خود گوش نشین ہو گیا۔

یہ سب کچھ تختہ و خوبی ہو گیا لیکن قدرت کو کچھ اور ہی محفوظ تھا۔ ایشائے کوچ کے مغرب میں بھیڑ چین کے ساحل پر کوہ ایڈا کے دامن میں واقع ایک شہر "ڑائے" میں شاہ پیام کے گھر پیدا ہونے والا شہزادہ پارس، حسن کی دیوبی افروذیت کے مشورے اور مد سے کچھ کا کچھ کر بیٹھا۔ اس نے بیلن کو درغایا اور اسے اغوا کر کے شہزادے کے لئے مصیتوں کے پہاڑ کفرے کرتے۔

پارٹا کے شاہ مینیاؤس نے اہل یونان کو ان کا وعدہ یاد دلایا اور اپنی یوی (بیلن) کی بازیافت میں ان سے مد چاہی۔ جس کے نتیجے میں یونان کے بڑے بڑے جنگجو سرداروں نے اپنے اپنے لشکر کے ساتھ ایک بڑے بھری بیڑے کے ذریعے ڑائے پر چڑھائی کی۔ اس مم میں جہاں ایڈا کا عظیم جنگجو سردار اوڈیوس (یوی س) جتل ہیرو ابجکس اور اکبیس کے شانہ بثانہ داد شجاعت رہتا رہا۔ وہیں بیلن کو اغوا کرنے والے شہزادہ پارس کے بڑے بھملی یکٹر نے اپنی جان، جان آفرن کے پرد کر دی۔ اصل مجرم پارس اس جنگ میں زخمی ہو کر گماہی کی موت مر گیا۔ شہزادے مکمل طور پر برباد ہو گیا۔ اور شاہ مینیاؤس نے اپنی بے وفا یوی (بیلن) کی بازیافت پر اس کا قصور معاف کر دیا۔

القصہ، طویل جنگ کے خاتمے پر اوڈیوس اپنی حسین و جیل یوی پینے لوہا اور بینے ٹلی ماکس سے واپس جا لئے کی خاطر اپنے بچے ٹھکنے سپاہیوں سیست جہاز پر سوار ہوا اور سندھری طوفان میں راستے سے بھلک کر ایک ویران جزیرے پر جا اتر۔

ڑائے کی جنگ لگ بھگ دس برس تک مسلسل یوی گئی تھی؛ اور اس حدت میں اوڈیوس کی یوی پینے لوہا کو اپنے شوہر کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اوڈیوس زندہ ہے یا مر گیا۔ لیکن اس کا دل کھاتا تھا کہ وہ ایک روز ضرور واپس آئے گا۔

تنی حدت گزر جانے کے سب اردوگو کے شہزادوں نے پینے لوہا کو یوہ خیال کرتے ہوئے، شادی لے لئے مجبور کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ اسی کے محل میں ڈیرے ڈال دیئے اور اوڈیوس کی دولت کو بری طرح برباد کرنے لگے۔ پینے لوہا کا بوڑھا سر لیٹریں، یہ حالات دیکھ کر دیئے کافم لئے ہوئے شر چھوڑ گیا۔

حالات دن بدن خراب ہوتے جا رہے تھے لیکن پینے لوپا کے دل میں اس کے خاوند کی محبت زندہ تھی۔ وہ اکثر سوچتی کہ کوئی مجرم ایسا ہو کہ اوڈسیوس گھراوٹ آئے۔ اس کا بیٹا ٹیلماکس ابھی کم سن تھا اور وہ سخت بجور۔

وہ تمام شاہزادگان کی دشمنی مول نہیں لے سکتی تھی، اس لئے اس نے بت سوچ پچار کے بعد ایک ترکیب یہ نکالی کہ ایک اونی شال بننے لگی اور یہ مشور کر دیا کہ جب تک یہ شال مکمل نہیں ہو جاتی، وہ شادی نہیں کرے گی۔ یوں، وہ دن بھر شال بنتی رہتی اور رات کو ادھیر دیتی۔

اوھر تو یہ حالات تھے، اوھر اوپس (عرش بریس) پر تمام دیوتاؤں کے باپ زیوس کے محل میں دیوتاؤں کی کونسل ہو رہی تھی۔ اتفاق سے سندھری دیوتا پوسائیدن غیر حاضر تھا۔ موقع سے فائدہ اٹھائے ہوئے صربان دیوی استھنی (جو حکمت کی دیوی تھی) نے سوال اٹھایا کہ اوڈسیوس نے ایسا کون سا گناہ کیا ہے کہ دریان جزیرے میں پڑا ہے.....؟ زیوس نے وضاحت کی کہ اوڈسیوس سے نادانشگی میں سندھری دیوتا پوسائیدن کا بیٹا سکرپ اندا ہو گیا۔ یوں سندھری سفر میں دیوتا اسے گراہ کرتا ہے، لیکن اگر سب دیوتا اتفاق کریں تو اوڈسیوس کی مصیبت مل سکتی ہے۔

استھنی دیوی نے اپنی ہوائی کھڑاویں پہنیں اور اوپس کی چوٹی سے تمکی طرح اپنکا میں اوڈسیوس کے نو عمر بیٹے ٹیلماکس سے ملاقات کی، سارا احوال معلوم کیا اور اسے یقین دلایا کہ اوڈسیوس ایک دن ضرور واپس آئے گا۔ پھر ابے چند ضروری مشورے دیئے اور صورت بدلت کر یکایک نظرؤں سے غائب ہو گئی۔ تب ٹیلماکس نے دیوی کو پہچانا اور اس کی روح میں دلیری کا احساس جاگا۔

اس وقت پینے لوپا کے عشاں شزارے بربط نواز سے گیت سن رہے تھے۔ اس گیٹ میں یونانیوں کی فتح کے بعد ڈرائے سے واپسی کا ذکر تھا۔ پینے لوپا نے اپنے ہالا غانے میں وہ گیت سن اور دیغڑا ہو کر جھروکے میں جا کھڑی ہوئی۔ اتنے میں ٹیلماکس بھی دہاں پہنچ گیا اور شاہزادوں سے یوں مطالب ہوا۔

"اے صاحبان.....!

آج رات تم حبِ فشاء کھاؤ یوں گر کل مج سب کو ایک کونسل کے سامنے آتا ہو گا، جو

ہر کے بزرگ لوگوں پر مشتمل ہو گی۔ مجھے تم سے دہاں ایک بات کہنی ہے اور وہ بات یہ ہے کہ تم میرے گھر سے پڑے جاؤ۔” یہ کہ کر وہ اپنی دایی کے ہمراہ خواجہ کی طرف چلا گیا۔

دوسرے دن بزرگوں کی مجلس منعقد ہوئی۔ جس میں ٹیلماکس نے، جس کی آنکھوں اور صورت سے خلاف معمول ایک خاص تم کا رعب نکل رہا تھا۔ کھڑے ہو کر اپنا دکھ اور خانہ بہادری کے اسماباب بڑے سورج پیرائے میں بیان کئے۔ پھر اس نے اپنا حصہ نہیں پردازے مارا اور بچوت پچوت کر رونے لگا۔ تھوڑی دری بعد انیش نے مکاری سے کہا۔

”اہل مجلس!! جو کچھ نوجوان ٹیلماکس نے کہا۔ اس کا لفظ لفظ راستی سے بھرا ہوا ہے، مگر اس میں ہم لوگوں کی کوئی خطا نہیں۔ خود اس کی ماں نے ہم سب کو خیہ پیغام بھیج بھیج کر بلایا اور تین چار سال سے ہر شخص کو جھوٹے وعدہ پر ٹال رہی ہے۔ ٹیلماکس اپنی ماں کو یا تو اس کے باپ کے مگر بھیج دے اور یا ہم میں سے کسی ایک کو اس کا نیا خاوند تعلیم کر لے۔ جب تک وہ یہاں موجود ہے ہم کہیں نہ جائیں گے اور اس کی دولت کو یو نہیں اڑاتے رہیں گے۔“

ٹیلماکس یہ سن کر پڑا اور اس نے جواب میں کہا۔

”میں اپنی ماں کو اس کی مرمنی کے خلاف کہے گھر سے نکال دوں۔۔۔؟ اگر تم لوگ جلد راہ راست پر نہ آئے تو میں زیور اور تمام غیر قانونی دیوتاؤں سے تمارے حق میں بد دعا کروں گا۔“

وہ قبولت کی گئی تھی۔ میں اس وقت دو عقاب اہل مجلس کے سروں پر اڑتے دکھائی دیئے جو ایک دوسرے کو اپنی چونچوں اور بیٹوں سے زخمی کرتے جاتے تھے، یہاں تک کہ دونوں لڑتے لڑتے اہل مجلس کے درمیان آ پڑے۔ اس وقت فال نکالنے والا بول اخفا۔ ”بے شک اوسیں سے گھر کی طرف چل پڑا ہے۔ ملک کو چاہنے والے فی الفور یہاں سے پڑے جائیں ورنہ وہ ایک ایک سے بدلہ لے گا۔“

اس پر اسے برآ جلا کا گیا۔ ٹیلماکس نے آخر میں اتنا کہ کہ اسے ایک جماز اور میں جماز ران ہی دے دیئے جائیں کہ اپنے باپ کو لینے پانکھوں اور اسپارٹا کے پاس

جا سکوں۔ لیکن اہل مجلس نے اس کی درخواست پر کان نہ دھرا اور میلماسک غلکین، فکت دل سندھ کی طرف نکل گیا۔ جہاں اس نے ہاتھ دھونے اور احتصنه دیوی کے حضور مد کی الجا کی۔ دیوی کے اشارے پر میلماسک سیدھا گھر پہنچا اور اپنے باپ کے تو ش خانے کی جانب نکل گیا۔ جہاں چاندی اور سونے کے ساتھ روغن زیتون اور ارغوانی شراب کے ملکے دھرے تھے۔ اس نے سارے اسہاب کا جائزہ لینے کے بعد اپنی دایہ پور سکلیا کو اپنے ارادوں سے آگاہ کیا۔ اس نے رنجور بڑھا کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ۔

”دیوتاؤں کی بھی مرضی ہے۔ تو رنج سے اپنا دل نہ جلا۔ میں جا رہا ہوں لیکن بت جلد کامیاب وابس لوٹوں گا۔ مگر دیکھ میری ماں سے گیارہ دن تک یہ بات نہ کرنا کہ میں کہاں ہوں۔“

اس انشا میں احتصنه دیوی نے ایک جہاز معد بیس جمازوں کے بندرگاہ تک پہنچا دیا اور شام پڑنے پر میشور کا بروپ بھر کر محل پہنچی۔ اس کے دہاں فکٹے ہی شاہزادوں پر ایک عجب نیند کا غلبہ ہوا اور وہ سب اوچھنے لگے۔ تب اس نے میلماسک کو اس کے سامان سیست بندرگاہ تک پہنچا دیا۔ جہاز کے ہادیان کھول دئے گئے اور لٹکر انہوں دیا گیا۔ مغرب کی سمت سے خوٹگوار ہوا چلتے گئی، اس وقت خود احتصنه دیوی جہاز چلا رہی تھی۔ میلماسک نے تمام غیر平凡ی دیوتاؤں اور احتصنه دیوی کے حضور ارغوانی شراب کی قربانی گزرائی۔

سچ جب میلماسک کے یکاکیق غائب ہونے کی خبر پہنچی تو بد ذات اینٹوس کو اس کی جرات پر سخت حیرت ہوئی اور اس نے ارادہ ظاہر کیا کہ وہ میلماسک کا سندھر میں پہچا کرے گا اور اس کے جہاز کو ڈبو دے گا۔ یہ خبر میدین نقیب کے ذریعے ملکہ پہنچنے لوپا تک بھی پہنچی۔ پہنچنے لوپا کے رونے دھونے سے محل میں اک کرام جمع گیا۔ پہنچنے لوپا نے رنج و ملال کی حالت میں احتصنه دیوی کے حضور گھوڑا کر دعا مانگی اور روتے روتے سمجھی۔ ادھر احتصنه دیوی کی مہماںی سے میلماسک کا جہاز امکن و امان کے ساتھ پانکوس کے ساحل سے جا لگا۔ جہاں سے فرضی میشور کو ساتھ لئے میلماسک شاہ پاؤں کے محل پہنچا۔ اسے شاہ نے بتایا کہ کس طرح ڑائے کی جگ کے ٹھانے پر دیوتاؤں نے سردار اگمنون اور سردار میناؤں کے درمیان جھوڑا کروا دیا، جس کے سبب بھری بیڑا دو حصوں

میں بٹ گیا۔ سردار میناؤس اپنے وطن کی طرف روانہ ہوا جب کہ اوڈسیوس جو پلے سردار میناؤس کے ساتھ تھا، سردار اگمنون سے جا طلا۔ اس کے بعد کا احوال نہیں معلوم کہ اوڈسیوس پر کیا گزری۔ شاید شاہ اسپارتا کو کچھ پتا ہو۔

اگلے روز نیشور نے ایک رتحہ میں دو سبک خرام گھوڑے جتوائے اور سامان سفر تیار کر کے ٹیلماکس کو اس پر سوار کیا۔ خود اپنے بیٹے کو رتحہ ہان کی خدمت پرداز کر کے اسپارتا روانہ کر دیا۔ وہ لوگ دوسرے دن غروب آفتاب کے بعد اسپارتا پہنچے، جہاں بت بڑے جشن کا سماں تھا۔ پتا چلا کہ شاہ اسپارتا میناؤس کے محل میں دو شادیاں رپنے والی ہیں۔ ایک تو اس کی بیٹی ہر موئی جو ہیلن کے بھن سے پیدا ہوئی تھی، اپیلان کے بیٹے نپالیوس سے پیاسی جانے کو تھی جب کہ دوسری شادی اس کے بیٹے میگا ہستیج کی تھی، جو ایک لونڈی کے بھن سے تھا۔

شاہ میناؤس نے ٹیلماکس کا بڑے ٹاک سے خبر مقدم کیا اور سارا قصہ من کر آبدیدہ ہوا۔ وہاں ملکہ ہیلن بھی موجود تھی، جس نے ٹیلماکس کی شکل صورت سے اسے پہچان لیا۔ بڑی دعوت کے دوران میں شاہ میناؤس نے بتایا کہ اوڈسیوس زندہ تو ہے مگر ایک جزیرے میں کلپسو دیوی کے ہاں مجبوراً پڑا ہے۔ کلپسو دیوی نے اسے اپنے دام محبت کا امیر کرنا چاہا ہے لیکن اوڈسیوس کا دل اپنے وطن اور بیوی بیچے میں انکا ہوا ہے۔ شاہ میناؤس نے یہ تمام باتیں پیش گویاں کرنے والے چلاوے کے حوالے سے بتائیں، جو اپنی صورتیں تبدیل کر سکتا اور مستقبل کا حال بتاتا تھا۔

شاہ میناؤس نے وہاں سے رخصت کرتے وقت ٹیلماکس کو بت سے تنخ دئے جو عذر میں اس کے کسی کام کے نہ تھے۔ ٹیلماکس نے تحائف کو دیں چھوڑا اور واپس ہو لیا۔

ادھر اوڈسیوس ٹرانے ہی واپسی پر سمندری طوفان میں راستے سے بھک کر ایک دریان جزیرے پر جا اترًا، جہاں کے باشندے یونانیوں کے جانی دشمن تھے۔ اوڈسیوس نے جزیرے کے پاپیہ تنخ اماروس کا محاصرہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا اور وہاں کے بہت سے لوگ ہلاک ہوئے، لیکن اس کی یہ فتح عارضی تھی۔ سائیکون قوم نے گردنوواح کے لوگوں کو جمع کرنے کے بعد اوڈسیوس کے ملکی بھر لٹکریوں کو ٹکست دی۔ اوڈسیوس نے بڑی

مشکل سے جان بچائی اور باقی ماندہ افراد کے ساتھ ایک بار پھر سمندر میں آگیا۔ راس
مالیا کے مقام پر پہنچ کر اسے ایک بار پھر شدید سمندری طوفان کا سامنا کرنا پڑا اور اس کا
بھری ہڈا بیچھے ہٹتے ہٹتے کھیرپا جا پہنچا۔ سمندر کی طوفانی کیفیت نو دن بعد دور ہوئی تو
اوڈسوس کا جہاز ایک ایسے ساحل پر لگا، جہاں کے باشندے کنوں کے پھول کھاتے تھے۔
ساحل سے اوڈسوس نے اپنے چند ساتھیوں کو پانی لانے جزیرے پر بھیجا۔
جنہیں وہاں کے افراد نے کنوں کے پھول نذر کئے۔ پھل کھاتے ہیں وہ اپنے وطن اور
ہم الوطنوں کو بھول بیٹھے۔ اوڈسوس نے انہیں بڑی مشکل سے پکڑا اور ہاتھ پاؤں باندھ کر
جہاز پر لا ڈالا اور وہاں سے روانہ ہوا۔ سمندر میں رات بھر بھکلنے کے بعد وہ ایک ایسے
ملک میں پہنچے جہاں نگلوپیں قوم آباد تھی۔ نگلوپیں لوگوں کے ماتھے پر ایک ایک آنکھ تھی
اور وہ سب دیوار، گھر پانی کرتے تھے۔ وہ لوگ تندب سے عاری اور دیوتاؤں کو مانتے
والے تھے۔ وہ خود رو چیزیں جو زمین سے اٹھتی تھیں، کھاتے اور ہر قسم کے قانون سے
بے نیاز تھے۔

اوڈسوس بارہ افراد کے ساتھ اس آبادی کا پہاڑی نشان جانے کے لئے زمین پر
اٹرا۔ ابھی وہ زیادہ دور نہ گئے تھے کہ ایک بڑے غار پر نظر پڑی۔ غار میں ستونوں کی
جگہ بڑے بڑے درختوں کے تئے رکھے تھے۔ اوڈسوس مد ساتھیوں کے اندر گیا اور کسی
کو نہ پایا۔ شام کے قریب اوڈسوس اور اس کے ساتھی آرام کر رہے تھے کہ ایک شور
نا جیسے بہت سے مکاہات گرائے جا رہے ہیں۔ وہ سب غار میں دبک کر بیٹھ گئے۔ وہ یہ
دیکھ کر حیران ہوئے کہ ایک آنکھ والا دیو، جس کا ذیل ڈول ڈول مایک پہاڑ کی مانند تھا، غار
کے اندر داخل ہوا اور نگلوپیوں کا ایک بڑا گٹھا زمین پر پھینک کر دو دوہو دینے والی ماداوں کو
غار کے اندر ہاتھے لگا۔

اس دیو کا نام یونیفیوس تھا اور وہ اپنے آپ کو ہنچمن (سمندر کے دیوتا) کا
بیٹا کہتا تھا۔ اس نے ماداوں کا دو دوہو لینے کے بعد غار کا جائزہ لیا تو اوڈسوس اور اس
کے ساتھی دکھائی دیئے۔

وہ گرج کر بولائیں!!!!

"اے نوگو تم کون ہو...؟ راہزن ہو یا سوداگر...؟"

اوڈسیوس نے جواب دیا کہ "نہ تو راہزن ہیں اور نہ سواؤگر، بلکہ آوارہ وطن یونانی ہیں۔ اوڈسیوس نے منت کر کے کما کہ مشتری دیوتا کی خاطر ہماری جان بخشی اور مدد کر جس پر پولیخیوس بولا۔"

"پیو تو فو...!! تم اتنی دور سے مجھے دیوتاؤں کے خوف کی تعلیم دینے آئے ہو۔ ہماری قوم مشتری دیوتا کو خاطر میں نہیں لاتی۔ ہم تمام دیوتاؤں سے زیادہ نور آور ہیں۔" اس کے بعد اس نے اوڈسیوس کے دو ساتھیوں کو اخفاکر زمین پر دے مارا، جس سے ان کا سر پھٹ گیا۔ اس نے ان دونوں کو کھا لینے کے بعد بکریوں کا سارا دودھ پی لیا اور لمبی تان کر سو گیا۔ اوڈسیوس اور اس کے ساتھی غار سے باہر اس لئے نہیں نکل سکتے تھے کہ غار کے دہانے پر بھارتی چڑان پڑی تھی۔ وہ رات انہوں نے بڑے خوف و ہراس میں کامی۔

صح نمودار ہوئی اور وہ دیوزاد جاگا تو ایک بار پھر ناشتے میں اوڈسیوس کے دو مزید ساتھیوں کو بھون کر کھا گیا اور غار کے دہانے پر بھارتی پتھر رکھ کر بکروں چرانے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد اوڈسیوس نے لکڑی کی ایک مضبوط اور بھارتی شاخ کو ایک سرے سے چھیل کر نوکدار بنایا اور اسے آگ میں سینک کر خوب سخت کر لیا۔ جب شام ہوئی اور دیو آیا تو اس نے آتے ہی اوڈسیوس کے دو دیگر ساتھیوں کا ناشتہ کیا اور بینچہ ریا۔ اوڈسیوس نے ہمت کر کے اسے ایک جام شراب کا پیش کیا اور پہ منت عرض کیا کہ یہ بڑے مزے کی چیز ہے۔ دیوزاد نے ایک جام پینے کے بعد سور میں آ کر مزید طلب کی۔ الغرض بہت سی شراب پی جانے کے بعد اس نے اوڈسیوس سے اس کا نام پوچھا۔ جواب میں اوڈسیوس نے کہا۔ "یوٹس" جس کے معنی ہیں، "کوئی نہیں۔" دیوزاد پولیخیوس نشے میں ناقابل ایسا سویا کہ ہوش نہ رہی۔ اوڈسیوس نے موقع کو نیمت جان کر نوکیلی لکڑی نکالی اور اسے خوب گرم کرنے کے بعد تمام ساتھیوں کے ساتھ مل کر زور سے دیوزاد کی ماتحت پر گئی آنکھ میں بھونک دیا۔ دیو نے مارے ورد کے جیج جیج کر آسمان سر پر اخفا کیا۔ نیچے، پکار سن کر اس کے دیگر پڑوی دوڑے آئے اور باہر سے ہی اس کا سبب دریافت کیا۔ پولیخیوس نے کراہ کر جواب دیا۔

"یوٹس۔" اس پر وہ بولے کہ "اگر تجھے کسی آدمی نے نہیں ستایا تو ضرور یہ تکلیف اللہ

کی طرف سے ہے، جسے کوئی نہیں تھا۔ ”پس وہ سب داپس چلے گئے۔

دیوزاد پوچھیوس درود سے جتنا چلا تا اور اندر بھرے میں بھلتا، غار کے دہانے پر پہنچ گیا اور پھر سرکا کر اس انتظار میں بینچ گیا کہ صحیبکریوں کے ریوڑ کے ساتھ جو کوئی باہر نکلا اسے پکڑے گا۔ مگر اوڈسیوس بھی کچھ کم چلا کر نہ تھا، اس نے بید کی گریں بنا کیں اور اس کے ساتھ تین تین سکونتوں کو ایک ساتھ پاندھ دیا۔ صحیب ان سکونتوں کے درمیان بینچ کی طرف اپنے ایک ایک ساتھی کو چھپا کر ریوڑ کے ساتھ باہر نکل گیا۔ پھر ان سکونتوں کو ہاتکتا ہوا جہاز پر پہنچا اور وہیں سے چلا کر کما۔ ”ہدزادت کلوب مشتری دیوتا نے میرے ہاتھوں بینچے سنکلی کا مزہ چکھایا۔“

یہ سنتے ہی دیوزاد نے نہیں میں آ کر ایک بڑی چنان، پہاڑ سے اکھاڑی اور اوڈسیوس کی آواز کے اندازے پر لڑکا دیا۔ جس کے سمندر میں گرتے ہی ایسا موجز پیدا ہوا کہ جہاز ڈول گئے۔ اس پر اوڈسیوس نے پھر چلا کر کما۔ ”مکلوپ اگر کوئی تجھ سے دریافت کرے کہ تجھے کس نے انداھا کیا تو کہ دینا کہ لیرنس کے بیٹے اوڈسیوس نے جو ایکلا کا سردار اور شروں کا غارتگر ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے جہاز بڑھا دیا۔

اب ان کا جانا اس جزیرے پر ہوا جہاں کا حکران ہواں کا دیوتا اولیوس تھا۔ وہ اوڈسیوس سے بڑی صربانی سے پیش آیا اور رخصت کے وقت اس نے اوڈسیوس کو قتل کی کھال میں شمال، مشرق اور جنوب کی ہوائیں بھر کر تھنے میں دیں اور صرف مغرب کی ہوا کو چلتا رہنے دیا تا کہ اوڈسیوس ایکلا تک پہنچ جائے۔ جب کہ اس بات کا اوڈسیوس کے ساتھیوں کو علم نہ تھا۔ مغربی ہواں کی مدد سے نو دن تک وہ سمندر میں ایکلا کی طرف روان دوں رہے، یہاں تک کہ رات کی تاریکی میں ایکلا کی روشنیاں جھلکلاتی دکھائی دیں۔

نو دن رات کی اس طویل مسافرت نے اوڈسیوس کو تھکا دیا تھا۔ وہ جہاز رانی کے فرانچ اپنے ساتھیوں کو سونپ کر لیٹ گیا تو اس کی آنکھ لگ گئی۔ اس کے چند حریص ساتھیوں نے موقع کو نجیم سمجھا اور جیتی خزانے کو ہتھیانے کی خواہش میں نیل کی کھال کو ادھیز ڈالا اور تمام ہوائیں جو اس میں بند تھیں پر شور سنتاہت کے ساتھ باہر نکل گئیں۔ ان کا جہاز ہواں کے تھیزیزے کھاتا ایکلا سے الٹا پھرنے لگا۔ یوں آتا فانا

جہاز جیکے بنتے بنتے ایک بار پھر شاہ اوڈیوس کے جزیرہ میں جا پکنچا۔

اوڈیوس نادم و پریشان دوبارہ اوڈیوس کے حضور میں حاضر ہوا لیکن اس بار اوڈیوس نے خسے میں آ کر اسے دھکا دیا۔ اوڈیوس وہاں سے ہاتھ چل تو پڑا لیکن اب جہاز کو چاروں سمت کی شدید ہواؤں کا سامنا تھا۔ اس طرح چھ دن اور چھ رات سمندر میں مارے مارے پھرنے کے بعد ساتویں دن اوڈیوس لاموس جا پکنچا۔ اس نے دو ساتھیوں کو جزیرے سے متعلق معلومات حاصل کرنے نہیں پر اتار دیا۔

اس کے پیغامبر ابھی دور نہ گئے تھے کہ اوڈیوس خود بھی جہاز پھوڑ کر ایک چنان تک چل کر آگیا۔ جہاں اسے ایک کنوواری لڑکی ملی جو چشمہ پر پانی بھرنے جاتی تھی۔ وہ لڑکی قد و قامت میں انسانوں سے بڑھ کر تھی۔ وہ اوڈیوس کے ہر سوال کے جواب پر چپ ہی رہی اور اشاروں کنایوں کے ذریعے اوڈیوس کو اپنے ساتھ جانے پر قابل کر کے، اسے اپنے گھر لے گئی۔ اب اس کی ملاقات اس لڑکی کے باپ ایشیغاس سے ہوئی، جو دیوؤں کا بادشاہ تھا۔ لڑکی کی ماں دوڑتی ہوئی آئی، جس کے بہت لمبے قد نے اوڈیوس کو حیران کر دیا۔ لڑکی کے باپ ایشیغاس نے اوڈیوس کے ایک ساتھی کو کپڑ کر کھا جانا چاہا تو دوسرا ڈر کر بھاگا، مگر دیو نے زور سے آواز لگا کر اپنے ساتھیوں کو بلا لیا اور یوں سب نے اوڈیوس کے بھری بیڑے پر بڑی بڑی چٹائیں میٹ کی طرح بر سائیں، جس سے صرف اوڈیوس کے اپنے جہاز اور چند ساتھیوں کے سوا سب کچھ برباد ہو گیا۔ اوڈیوس کے شکریوں کی لاشیں سمندر میں تھر رہی تھیں اور دیو انہیں مچھلیوں کی طرح اپنی بر بھیوں میں چھید کر نکالتے اور کھاتے تھے۔ اس ہنگائے میں اوڈیوس کو اپنے چند ساتھیوں سمیت بھاگ نکلنے کا موقع مل گیا۔

لاموس کے جزیرے سے روان ہو کر اوڈیوس کا جہاز ای آ کے جزیرہ میں پکنچا۔ جہاں سورج کی بیٹی "کرکی" جادو گرفتی رہا کرتی تھی۔ اس بار جزیرے کی خبر لانے کا قریب یورٹاکس کے نام تھا۔ یورٹاکس اور اس کی جماعت، جس میں بائیس آدمی تھے، اوڈیوس سے رو رو کر رخصت ہوئے۔

وہ جزیرے پر آگے بڑھے تو انہیں ایک عالیشان عمارت دکھائی دی، جس کے پھاٹک پر شیر، چیتے، تیندوے اور بھیڑیے پیٹھے تھے۔ یہ درندے اجنبیوں کو دیکھ کر انہوں

کھڑے ہوئے اور یورٹاکس اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھ پاؤں چانٹنے لگے۔ خونخوار جانوروں کے اس اختلاط سے ان بیچاروں کا خون خلک ہو گیا۔ وہ دم بخود کھڑے تھے کہ اندر سے کرکی جادوگرنی کے گانے کی آواز آئی۔ وہ کرگاہ پر بیٹھی ہوئی کھنڈی پر ایک نیس جالی بن رہی تھی۔ اس کی دلکش آواز ہوش بھلا دینے والی تھی۔ یہاں تک کہ مقرر ہو کر یورٹاکس کے ساتھیوں نے جھانک پر دستک دی۔ کرکی جادوگرنی نے اپسیں خوش آمدید کہا اور اندر لے گئی۔ صرف یورٹاکس اندر نہیں گیا اور مبرکیا۔ کرکی جادوگرنی نے مسافروں کے آگے، شد اور سرنا کی شراب رکھی اور جادو کے زور سے ان سب کو سوروں میں تبدیل کر دیا۔

یورٹاکس نے جھانک کر دیکھا کہ کرکی جادوگرنی نے ان سب کو سوروں کے باڑے میں ہاٹ دیا ہے اور ان کے سامنے سوروں کا کھاجا ڈال دیا ہے۔ یورٹاکس لئے پاؤں واپس پھرا اور اوڈسیوس کو ساری کھتائی۔ اوڈسیوس سے برداشت نہ ہوا اور وہ تن تھا جادوگرنی کے محل کی ست بڑھا۔

وہ اندر قدم رکھنے کو تھا کہ ستری عصا تھاے ایک نوجوان (عطارد دیوتا) نے اسے پہلے تو اندر جانے سے باز رکھا اور پھر اس کی بہادری کے صدقے اسے ایک لمن کا پھول دیا، جو جادو کا توڑ تھا۔

اوڈسیوس کی دلکش پر کرکی جادوگرنی مسکراتی ہوئی آئی اور اسے بھی اندر لے لئی۔ جب اوڈسیوس جادو بھری شراب پی چکا تو جادوگرنی نے اسے سور بنانے کی خاطر بادوی عصا سے چھووا اور بولی۔

”چل سوروں کے باڑے میں نکل جا۔ اپنے ساتھیوں میں جا مل۔“ مگر اوڈسیوس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اب اوڈسیوس نے تموار کے ساتھ اس پر حملہ آور ہونا چاہا تو وہ اس کے قدموں پر گر پڑی اور بولی۔ ”تو ضرور اوڈسیوس ہے جو دانائی کے لئے شہر آفاق ہے۔ دیوتاؤں نے میرے مقدر میں لکھ رہا ہے کہ میں تمہے ساتھ سنجوگ کروں۔ دیکھ یہ مغدور دل تمہے آگے جھلکا ہے۔ ایک دیوی تجھ سے اکھمار الٹ کرتی ہے۔“

کرکی نے سمجھ (پاتال کا دریا) کی حرم کھائی کہ اس کے ساتھ دھوکہ نہ کرے

گی۔ تم لینے کے بعد اوڈسیوس اس کے ساتھ محبت سے پیش آیا۔ جب اوڈسیوس کے سامنے خوان نعت چنا گیا تو وہ اپنے ساتھیوں کے لئے مفہوم تھا۔ کرکی نے اس کی خوشی کی خاطر اوڈسیوس کے ساتھیوں کو سوروں سے انسان بناایا اور ان سب کے ساتھ اتنی صربانی سے پیش آئی کہ اوڈسیوس اور اس کے ساتھی اس کی محبت میں بیش و غirth کے ساتھ بارہ میتے رہے۔ کرکی جادوگرنی ان کی دلچسپی کی خاطر درختوں کو نچاتی اور دل خوش کرنے کیلیں پیش کرتی۔ یکاںکہ اوڈسیوس کو وطن کی یاد آئی۔ اس نے تھانی کی ملاقات میں کرکی سے مدد چاہی اور کرکی نے ہوئے بھی اپنے محبوب اوڈسیوس کو جہاز کا لٹکر اٹھانے کی اجازت دے دی۔

اب اوڈسیوس کے ذہن میں ایک الجھن تھی کہ کیا اس کی بیوی نے اتنا عرصہ اس کا انتظار کیا ہو گا.....؟ کیا اس تمام عرصے میں اس کی وفادار رہی؟ وہ حقیقت جانتا چاہتا تھا، جس کے لئے پاتال کا سفر ضروری تھا، جہاں ترسیں کی روح سے سب کچھ دریافت کیا جاسکتا تھا۔

کرکی جادوگرنی نے اسے الوداع کئے ہوئے بتایا کہ شماں ہوا اس کے جہاز کو ایک ایسی سرزمین تک پہنچا دے گی، جہاں بید مجنون کے باعث ہیں۔ دریائے گھنیم اور دریائے پریخیل وہیں سمندر میں گرتے ہیں، وہی پاتال ہے، وہاں پہنچ کر ایک ہاتھ چوڑا اور ایک ہاتھ لمبا گڑھا کھود کر اس میں دو دھ، شمد، شراب اور زربھیر اور سیاہ بجھیز کا خون ڈالنا، مگر یہ چیزیں ڈالتے وقت اپنا چہہ اس طرف سے پھیر کر رکھنا۔ مروے ان چیزوں کو کھانے آئیں گے۔ مگر جب تک اپنا سوال ترسیں کی روح سے پوچھ نہ لو، کسی کو بھی اپنی قربانی کے قریب نہ جانے دیتا۔

اوڈسیوس وہاں سے چلا اور پاتال میں پہنچ کر اس نے کرکی کی ہدایت کے مطابق قربانی، ترسیں دیوتا نے نکل کر اسے بتایا کہ پوسائیدن دیوتا کی مخالفت کے باوجود اسے وطن دیکھنا نصیب ہو گا، بشرطیکہ راس ملٹ کر پہنچ کر تم اور تمہارے ساتھی سورج دیوتا کے بیلوں کو ذبح نہ کریں۔

اب مردوں کی روحلیں قربانی کھانے دوڑی آئیں۔ ان میں اس نے اپنی ماں کی روح بھی دیکھی ہے زارے کی جگ سے پسلے الوداع کہ کر آیا تھا۔ اس نے جوش محبت

میں آگے بڑھ کر ماں کے گلے لگ جانا چاہا تو وہ غائب ہو گئی۔ وہاں مشورہ معرفوں لوگوں کی روشنیں بھی تھیں۔ سردار اکمنون اور سردار اکلیس سے ملاقات ہوئی۔ اوڈسیوس نے اکمنون سے پوچھا کہ اس کے قبل از وقت مردوں میں شامل ہونے کا کیا سبب ہے.....؟ اکمنون نے جواب دیا کہ جسے زائے میں موت نہ آئی وہ بدکار یوی کی سازش کا شکار ہو گیا۔ پھر اکمنون نے زور دے کر کہا کہ خود اپنی یوی پینے لیجیا کے سوا کسی عورت پر اختیار نہ کرنا۔ وہ پاک دامن ہے، اس کی محبت کو نہ کھو رہا۔

سردار اکلیس نے اس سے پوچھا کہ مردوں میں کیوں آ گئے.....؟ میں تمام مردوں کی روحوں اور پاتال کا حکمران ہوں لیکن دنیا میں غلام بن کر رہنے کو اس مرتبے پر ترجیح رہتا ہوں۔ اوڈسیوس نے اس کے بیٹے کی جوانمردی کے کارنائے سنا کر اکلیس کو خوش کر دیا۔ وہیں اس کی ملاقات اپنے جگلی رقبہ اباکس سے بھی ہوئی۔ اوڈسیوس نے دیکھا کہ وہاں سی فس کی روح اب بھی اذیت میں بھلا ہے، جو ملکی رازوں کو افشا کرنے کے جرم میں اوپنچے پہاڑ تک بھاری پتھر لڑکاتا ہوا لے جاتا ہے اور پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر ہاکام ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اسے ہر کو لیس کی روح دکھائی دی۔ اگرچہ وہ غیر قانونی بہادر دیوبناؤں کے درمیان بہشت میں رہتا ہے اور عالم شباب کی دیوبی کے ساتھ بیش و عشرت میں معروف ہے، مگر اس کی روح پاتال میں ہے۔ وہ جب ظاہر ہوا تو تمام روشنیں چیگاڑوں کی مانند اس کی طرف پکیں اور ہر کو لیس کے نیچے سر پر چپتیں لگانے لگیں اور وہ انہیں تیتوں کا نشانہ بنانے لگا۔

پاتال میں اوڈسیوس کی ملاقات اور یعنی شکاری، نیٹس اور تھریس جیسے بہادروں کی روحوں سے بھی ہوئی۔ جب وہ ای آ کے جزویے میں واپس پلنا تو کرکی جادوگرنی نے اسے سورج دیوبناؤ کی سرزینی سے متعلق ہدایات دیں۔

کرکی جادوگرنی نے بتایا کہ سورج دیوبناؤ کی سرزینی اور اس کے بیلوں تک پہنچنے سے پہلے دو مشکل مقامات آتے ہیں۔ پہلی مصیبت تمن جادوگریاں ہیں جو توام پیدا ہوئی تھیں۔ ان کا نام سارینس ہے۔ وہ تینوں ایک مرغزار میں بیٹھا رہتی ہیں اور ساحل کی جانب آتے ہوئے جماز کو دیکھ کر نہایت شیرس راگ الاتھی ہیں۔ تو ان کی آواز کے حمر میں آجائے گا اس لئے ساحل تک پہنچنے سے پہلے ساتھیوں کو کہا کہ تجھے جماز میں ہاتھ

پاؤں باندھ کر ڈال دیں اور تیری منٹ زاری پر بھی بچھے آزاد نہ کریں۔
اس کے بعد کرکی جادوگرنی نے کہا۔ ”دوسری مصیبت یہ ہے کہ جادوگرنوں سے
بچ کر جب اٹلی اور سلی کی درمیانی آبائے تک پہنچو تو خبردار رہتا۔ وہاں پہاڑوں کی
چٹانوں میں دو مردم خور دیوبنیاں رہتی ہیں۔ اس میں سے ایک سکلا ہے اور دوسری
کاربڈس۔ سکلا کی چھ لمبی گردئیں ہیں اور اتنی بد صورت ہے کہ انسان اور دیوتا اس کی
بد صورتی کی تاب نہیں لاسکتے۔ وہ تیرے صرف چھ آدمیوں کو کھائے گی۔ کوشش کرنا کہ
تم اس سے دور رہو۔ کاربڈس دن میں تین مرتبہ سمندر کو پہنچی ہے اور اگلی ریتی ہے
جب وہ سمندر کا پانی پی رہی ہو تو اس سے دور رہتا۔ سکلا غیر قافی ہے، اسے مارنے کی
کوشش نہ کرنا البتہ اپنے ساتھیوں کو سوت سے بچانے کے لئے سکلا کی ماں کریمیں کے
کسی دیوتا کی دہائی دینا شاید تیرے ساتھی بچ جائیں۔“

کرکی جادوگرنی سے ملاج شورے کے بعد اوڈسیوس اپنے ساتھیوں کے ساتھ
وہاں سے چل دیا، لیکن یہ لوگ سوکوس بھی نہ گئے ہوں گے کہ ہوا چلانا بند ہو گئی اور
سمندر بے حس و حرکت ہو گیا۔ پس اس نے جلدی سے اپنے ساتھیوں کے کانوں میں
موم بھر دیا اور خود کو زنجیروں سے جکڑ لیا۔ سایر نس جادوگرنوں کی دلکش آواز ہرست
سے آ رہی تھی۔ اوڈسیوس نے بھاگ کر جادوگرنوں تک پہنچتا چاہا لیکن اس کے ساتھیوں
نے اسے زنجیروں سے آزاد نہ کیا، جب وہ لوگ ان کی سرحد سے باہر نکل آئے تو
انہوں نے موم کانوں سے نکال ڈالا اور اوڈسیوس کو آزاد کر دیا۔

وہ بمشکل دو سو کوس آگے گئے ہوں گے کہ انہیں گرج دار آواز میں کتوں کے
بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ یہ سکلا کے کتوں کی آواز تھی۔ اوڈسیوس اور اس کے
ساتھیوں کے سینے میں دل دھل گئے اور وہ جہاز چلانا بھول گئے، تب اوڈسیوس نے ان کی
ہمت بندھائی اور وہ آگے بڑھتے گئے۔ اس وقت کاربڈس دیوتی سمندر کو پی اور اگلی ریتی۔
تھی۔ سمندر میں خالیم اور شور قیامت پا تھا۔ چھ گردنوں والی ۴۳س بد صورت دیوتی کو دیکھ
کر ان کے اوسان خطا ہو گئے۔ تب سکلا جادوگرنی نے اپنی چھ گردئیں پانی سے باہر نکالیں
اور اوڈسیوس کے چھ ساتھیوں کو انھا لے گئی۔ اس وقت اوڈسیوس، کریمیں جادوگرنی کے
دیوتاؤں سے دعا مانگنی بھول گیا اور اس کے چھ جانباز ساتھی لفڑے ابھل بن گئے۔

چلتے چلتے اب وہ ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں انہیں ملٹ نہ جزیرے میں
بڑے نہ والے خوبصورت بیتل چرتے دکھائی دیئے۔ وہ جزیرے پر اتر گئے۔ سب کی دن
کے بھوکے اور تھجے ماندے تھے لیکن اوڈسیوس نے اس صورت میں دہاں قیام کرنا منظور
کیا کہ سب میر کریں گے اور بیلوں کو پکلنے کی کوشش نہ کریں گے۔ اوڈسیوس خود
جاگ کر بیلوں کی حاجت کرتا رہا لیکن سمندر پر مختلف سوت کی ہوا۔ پہلی ری تھی اور وہ
آئے نہیں بڑھ کتے تھے، جس کے نتیجے میں انہیں ایک ماہ تک دہاں رکنا پڑ گیا۔ اللص
ایک روز دوپہر کے وقت تھجے ماندے اوڈسیوس کی آنکھ لگ گئی اور اس کے ایک ترجمی
ساتھی یورٹاکس نے موقع کو نیمیت سمجھتے ہوئے سب کے کھانے کی غاطر سات فریہ بیلوں
کو ذبح کر ڈالا اور سب نے سیر ہو کر کھایا۔ اوڈسیوس کی آنکھ سکھلی تو دیکھا کہ مردہ بیلوں
کی کھالیں زندہ بیلوں کی طرح ریگ ری تھیں اور بھنے ہوئے گوشت میں سے زندہ
بیلوں کے ڈکارنے کی آواز آ رہی تھی۔

سورج دیوتا نے اپنے باپ مشتری سے شکایت کی، "جس کے نتیجے میں ایک ماہ
بعد جب اوڈسیوس اور اس کے ساتھی اینیکا کی طرف روانہ ہوئے تو سمندر میں طوفان
انداز۔ جہاز کے یادیاں پھٹت گئے، مستول نوٹ گئے، اور جہاز ران سمندر میں جا گرا۔ پادری
زور سے گرج رہا تھا اور مشتری دیوتا کی آسمانی بکھلی کے ہاں اوڈسیوس کے ساتھیوں پر گر
رہے تھے۔ یوں سب ہلاک ہو گئے، صرف ایک اوڈسیوس تھا جس نے نوٹے ہوئے
مستول کو مضبوطی سے تھاے رکھا اور نو دن رات سمندر میں بھکنے پھرنے کے بعد جزیرہ
"اوگی گیا" کے ساحل پر جا لگا۔"

اوگی گیا کے جزیرے میں ہرے بھرے باغات تھے جن میں میوہ دار بچلوں سے
درخت لدے پھندے کھڑے تھے۔ دہاں اوڈسیوس کو ایک عالی شان محل دکھائی دیا۔ اس
سے پہلے کہ وہ دہاں تک پہنچا کپسہ دیوی دوڑی آئی اور اسے اندر لے گئی۔ کپسہ دیوی
نے دام محبت کچھ ایسی بچھائی کر ہنٹے کیا میئنے گزر گئے۔ وہ دونوں ہسہ وقت بھی اختلاط
میں مصروف رہے تاہم اوڈسیوس کو کسی طرح بھی اس سے دبکھی محسوس نہ ہوئی اور
اس کا تجھی اچھا ہوتا چلا گیا۔

اب اوڈسیوس کی حالت پر ایمجنی دیوی کو ترس آیا اور اس نے دیوتاؤں کی

مجلس میں داوطلب کیا۔ یوں مشتری دیوتا نے عطا کو جو دیوتاؤں کا پیغامبر ہے، حکم دیا کہ جا اور کپسو دیوی سے کہ کہ وہ اوڈسیوس کو رہا کر دے۔ کپسو دیوی نے مشتری دیوتا کے پیغام کو بادل ناخواست قبول کیا۔ ادھر اوڈسیوس اپنے دلن اور یوی بیٹے کی طرف سے ہائیس سمندر کے کنارے بیٹھا تھا۔ کپسو دیوی نے اس کے پاس پہنچ کر کہا۔ ”اے معموم بشر.....! اپنے دلن کے لئے اب اپنے دل کو زیادہ نہ کرہا۔ انھوں اور ایک جہاز تیار کر کیوں کہ دیوتاؤں کی بیسی مرضی ہے۔“

اوڈسیوس نے خوش ہو کر جواب دیا۔ ”اے عالی مرتبت دیوی.....! میں فانی انسان ہوں۔ اور ایک فانی عورت پہنچنے لوہا، جو میری یوی ہے، سے شوق ملاقات رکھتا ہوں۔“

تب ریوی نے اپنی خواصوں کو حکم دیا کہ چند عمدہ درخت کٹوا کر اوڈسیوس کے لئے ایک جہاز تیار کریں۔ چار دن میں ایک جہاز تیار ہوا اور پانچجیس دن کپسو دیوی نے بت سی خوراک اور مال و زر کے تحائف کے ساتھ اوڈسیوس کو الوداع کہا۔

فیکایا کے ساحل کے قریب پنجون دیوتا نے اپنی عصا اتنے زور سے سمندر میں ماری کہ طوفان برپا ہو گیا۔ اوڈسیوس کے جہاز کے بوڑھیلے پڑ گئے اور وہ لمبوں کے بیچ چلا گیا۔ لیکن ہت کر کے اس نے اپنے جہاز کو جا پکڑا۔ اس موقع پر کیدوس دیوتا کی بیٹی انولیو کو تمیثا نے رحم کھا کر اسے مشورہ دیا کہ اوڈسیوس کپسو دیوی کے دیئے ہوئے کپڑے اتار پھینکے۔ پھر اس نے اوڈسیوس کو ایک کمرنڈ تھنے میں دیا؛ جس کی مدد سے بھرا ہوا سمندر اس کا کچھ نہ بگاڑ سکا اور وہ تیرے دن پانی پر تھرتا ہوا ایک ایسی سرزی میں تک گیا جس کی ڈھلوانیں ساحل تک پہنچنے نہیں دیتی تھیں۔ اس آڑے وقت میں منوا دیوی نے اس کی مدد کی اور اسے دریائے کیلیو کے مخراج تک پہنچا دیا جہاں سے ہ آسانی ساحل پر چڑھا جا سکا تھا۔ اوڈسیوس نے خلکی پڑنے کے بعد پلا کام یہ کیا کہ انوکیو کو تمیثا کا دیا ہوا کمرنڈ اتار کر سمندر کے پرورد کر دیا۔ اسی عمل کی اسے تلقین کی گئی تھی۔

اوڈسیوس دریا کے کنارے کنارے چو ۷۰ آگے بڑھ رہا تھا۔ ادھر منوا دیوی شاہ اکینیوس کے محل میں پہنچی اور شہزادی نویکا کو جو محظوظ استراحت تھی شادی کی فوجہ سنائی۔

نویکا جست پت اٹھی۔ ماں باپ کی اجازت سے اپنے شادی کے کپڑے دھلوانے کی غرض سے اپنی خدمت گزاروں سے انہوئے اور دریا کی سوت چلی۔ دریا پر دھلائی کے دوران اپنی محنت کو خونگوار ہنانے کی خاطر دفعے دفعے سے وہ سب چوکان کھلائی تھیں۔ شزادی نے اپنی باری پر گیند کو اس زور سے اچھالا کہ وہ سمندر میں جا گری۔ جب وہ سب زور سے چلا گیں تو قریب ہی ایک ہرے بھرے کنگ میں سوئے ہوئے اوڈسیوس کی آنکھ کھل گئی۔ اس وقت اوڈسیوس کے تن پر کپڑا نہیں تھا اور حکم سے اس کی صورت گھری ہوئی تھی۔ نویکا کی خدمت گار لزکیاں شرم اور ڈر کے مارے اور ادھر ادھر چھپ گئیں۔

اوڈسیوس نے نویکا کے بیچھے بیچھے پھیپھی دریافت کیا۔ ”اے ڈائنا دیوی سے مشابہ لڑکی، یہ تاکہ میں کسی فانی خاتون سے مخاطب ہوں یا کسی دیوی سے.....؟“ نویکا نے جواب دیا۔ ”میں دیوی نہیں۔ ایک فانی لڑکی ہوں۔“ اب اوڈسیوس نے انجام کی کہ اسے ایک جوڑا کپڑے عطا ہت کئے جائیں تاکہ وہ اپنی برہنگی کو ڈھانپ سکے۔ یوں نویکا اسے ایک تالاب پر لے گئی جماں خصل کے بعد جب وہ بن سنور کر اس کے سامنے آیا تو وہ اس پر فریقت ہوئی۔

نویکا کا باپ شاہ اکینیوس اس کے ساتھ مہمانی سے بیش آیا۔ بادشاہ ملکہ اور درباری اوڈسیوس کی خوش بیانی سے خوش ہوئے۔ صحیح ہوتے ہی شاہ اکینیوس نے نقیبوں کے ذریعے اعلان کروایا کہ دیوتا سے مشابہ ایک سافر کی تعظیم کی خاطر ہر خاص و عام حاضر ہوں۔ محل مہمانوں سے بھر گیا۔ شاہی دعویت کے بعد مجلس رقص و سرود منعقد ہوئی، جس میں شاہ کے حکم پر ڈموڈوس کی طرف نے ہربط کی لے پر بہادروں کے کارنائے نانے شروع کئے۔ ٹرائے کی جگ سے متعلق بیان سن کر اوڈسیوس آبدیدہ ہو گیا۔ تب شاہ اکینیوس نے مفصل حال معلوم کیا اور اوڈسیوس نے سارا قصہ بیان کر دیا۔ وہ سب حیرت زدہ رہ گئے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ صحیح ہی ایک جہاز مدد سامان سفر کے اوڈسیوس کی اونچا رواجگی کی خاطر تیار کیا جائے۔ اگلے روز بادشاہ مدد امراء و وزراء کے، اوڈسیوس کو رخصت کئے بذرگاہ تک آیا۔ اس بھری سفر میں اوڈسیوس آرام سے سوتا رہا۔ جب جہاز اونچا پنچا تو جہاز رانوں نے بجائے اسے بیدار کرنے کے ایک سایہ دار کنگ میں آرام

سے لٹا دیا اور تمام سامان اور تختہ تھائے اس کے پاس ڈھیر کر کے اپنے دہنی طرف لوٹ گئے۔ افسوس کہ انہیں اپنے دہن پہنچا نصیب نہ ہوا۔ وہ تمام کے تمام نہ ہوں دیوتا کے غصب کا نشانہ بن گئے۔ نہ ہون دیوتا نے اوڑسیوس کو اس کے دہن پہنچانے کے جرم میں ان سب کو مدد جہاز کے پتھر کا ہنا دیا۔

اوڈسیوس جاگا تو اپنی سرزین کو نہ پہچان پایا۔ وہ شش دنخ میں تھا کہ اسے ایک گذریا دکھائی دیا۔ اوڈسیوس نے بڑے ادب کے ساتھ اسے سلام کیا اور پوچھا کہ یہ کون سا ملک ہے....؟ اس نے جواب دیا۔ "اونکا"۔ اوڈسیوس نے اپنی خوشی کو چھا لیا اور چالاکی سے کہا۔ "میں کرت سے آ رہا ہوں اور مجھے اس ملک کا نام نہیں معلوم۔" اس پر گذریے نے ٹھر کرتے ہوئے کہا کہ "تم اتنے عرصے بعد صحیح دستام اپنے لکھ پہنچ کے لیکن ہیرا پھیری سے باز نہیں آئے۔"

اوڈسیوس نے نظریں اندازیں تو دیکھا کہ وہ گذریا نہ تھا، منروا دیوی تھی۔ منروا دیوی نے اس کی آنکھوں کا غبار دھو ڈالا اور اوڈسیوس اپنی سرزین کو دیکھ کر خوشی سے نہیں کو بار بار چھوٹے لگا۔ تب منروا دیوی نے اسے تمام واقعات سے آگاہ کیا، جو اس کی غیر حاضری میں چیز آئے۔ اب اوڈسیوس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ کہیں وہ بھی شاہ اگمنون کی طرح یوی کے کسی عاشق کے ہاتھوں مارا نہ جائے۔ لیکن منروا دیوی نے اس کی ہمت بندھائی اور اس کا جسم ایسا کر دیا کہ وہ سرسری نظر ڈالنے پر اوڈسیوس دکھائی نہ دے۔ پھر اس کے اعلا لباس کو اتار کر پھینکا اور پیغامزے پہتا دیئے۔

اوڈسیوس فقیروں کے بھیس میں عصا بیکتا سب سے پہلے اپنے گھر بان سے ملا۔ کچھ ہی دری بعد اس کا بیٹا ٹیلماکس بھی اس سے آ ملا۔ ٹیلماکس اسے دیوتا سمجھا، لیکن جلد ہی اوڈسیوس نے اسے بتایا کہ میں دیوتا نہیں تھا باپ اوڈسیوس ہوں اور اپنے بیٹے کے بوسے لینے لگا۔ چذبات پر قابو پا کر اوڈسیوس نے اپنے بیٹے ٹیلماکس کی ہمت بندھائی اور اسے چند ہدایات دیں۔ ٹیلماکس کے واپس محل تک پہنچنے کے بعد اوڈسیوس بھی صاحبیکا ہوا شاہی محل جا پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ پیٹے لوپا کے چاہنے والے تیباخیں اڑا رہے تھے۔ وہ جھکا جھکا بھکاریوں کی طرح ہاتھ پھیلائے ایک ایک کے پاس کیا اور رب نے اس کی نہی اڑائی۔ بھنوں نے اسے محل سے باہر نکل جانے کا حکم دیا اور چند ایک

نے رم کا کر کھانے کو کچھ دیا۔

اوڈسیوس سرک کر دروازے میں جا بیٹھا اور جو کچھ مٹا اسے کھانے لگا۔ ساتھ ہی بلند آواز میں کتا جاتا تھا۔ ”جان و مال کے لئے تو انسان ہوتا ہے مگر یہ لوگ بسیار خوری کے لئے ہوتے ہیں۔“

میں اسی وقت اوڈسیوس کے پیچے پیچے ایک اور بھکاری آئیوس بھی چلا آیا، جو دہاں کی اکثر نیا نتوں میں سے اپنا حصہ لیا کرتا تھا۔ اوڈسیوس کو دہاں دیکھ کر اس کی آتش حمد بھڑک انھی اور اس نے دہاں پہنچتے ہی اوڈسیوس کو برا بھلا کرنا شروع کر دیا۔ اہل بھلیں کی وجہ ان دونوں کی طرف کیا ہوئی، سب کو ایک تماشا ہاتھ آگیا۔ سب نے لطف اخانے کی خاطر دونوں بھکاریوں کو بھڑکا دیا اور فتح پانے والے کے لئے ایک بکرا انعام تجویز کیا۔

اوڈسیوس نے یہ دیکھ کر کہ سوائے لڑائی کے اب کوئی چارہ نہیں رہا، اپنا فقیرانہ لباس اتار پہنچنا۔ تب آئیوس بھکاری کے حوصلے پست ہو گئے اور اس نے دہاں سے بھاگ جانا چاہا، لیکن اوڈسیوس نے چھوٹتے ہی اسے ایک ایسا مکا مارا کہ اس کے جزرے کی بڑی ثوٹ گئی۔

سب حاضرین نے اوڈسیوس کی تعریف کی اور بولے کہ آئیوس سے بھلے چھوٹے۔ شام کو محفلِ رقص و سرود جی اور ملکہ پینے لوپا کے طالب، محلِ تماشوں سے آتا کر جلد ہی اپنی خواب گاہوں کی طرف چلے گئے۔ اب اوڈسیوس نے ٹیلہماں سے ملاح نھرائی کہ کل اسلجھ خانے سے ہتھیار باہر نکالے جائیں اور اگر کوئی ان کا سبب دریافت کرے تو کہہ دیا جائے کہ اسلجھ پڑے پڑے زنگ آلود ہو گیا ہے۔ اسے صاف کرنا مقصود ہے۔

اوڈسیوس نے اپنی بیوی پینے لوپا کی محبت میں بے قرار ہو کر محل کے اندر جانے کی نھرائی۔ یوں وہ خیہ راستوں کے ذریعے جن سے وہ خوب واقف تھا اندر جا پہنچا، اس وقت ملکہ کی خواصیں پینے لوپا کو بالا گانے سے پیچے خوابگاہ کی طرف لئے جا رہی تھیں۔ ملکہ نے یکفتِ حکم دیا کہ بوڑھے نقیر کو حاضر کیا جائے، بت ملکن ہے اسے اوڈسیوس کی بابت کچھ پتا ہو۔

اوڈسیوس کو ملک کے سامنے حاضر کیا گیا تو وہ اسے نہ پچان پائی اور اسے سیاح تصور کیا۔ تب اوڈسیوس بولا کہ میں شاہ ماٹوس کے پوتے انڈومنس کا بھائی ہوں اور روئی کے لئے محتاج - ایک زمانہ تھا جب اپنی کا سردار اوڈسیوس بھی میرا مھمان ہوا تھا۔ اس نے اوڈسیوس کے لباس کا بھی ذکر کیا جس سے پہنچنے لوپیا کو یقین ہو گیا کہ اس نے ضرور اس کے سرتاج کو دیکھا ہے۔ اوڈسیوس نے باقتوں ہی باقتوں میں پہنچنے لوپیا کو یقین دلایا کہ اس کا سرتاج زندہ ہے اور بہت جلد واپس آ جائے گا۔

سچ ہوئی تو شاہی محل پہنچنے لوپیا کے چاہنے والوں سے بھر گیا۔ اوڈسیوس، بوڑھے بھکاری کی صورت میں دروازے پر بینخا کھا پی رہا تھا۔ حاضرین نے اسے خاتر سے خوکریں ماریں اور برا بھلا کما۔ صرف ایک شخص فلیپس تھا جس نے شرمندگی کا انہصار یوں کیا۔

«آفرن.....! اے بزرگ سیاح۔ جو برا سلوک تیرے ساتھ ہوا ہے، اس سے میری پیشانی پر عرق آگیا ہے۔»

حاضرین میں تھیو کالئنس بھی تھا جسے مندا دیوی نے پیش بینی کی قوت بخشی تھی۔ تھیو کالئنس نے یکخت پکار کر کہا۔ "یاد رکھو تم سب بہادرو ہلاک ہو گے۔" یہ کہ کر وہ چپ چاپ باہر نکل گیا۔ اور یلماس اپنے باپ کے اشارے کا منتظر تھا۔ زیگ آلوار ہتھیار سامنے پڑے تھے اور کوئاہ اندیش شزادے کھانے پہنچنے میں مگن۔ ان ہتھیاروں میں ایک کمان بھی تھی جسے اوڈسیوس ٹڑائے کی طرف جاتے ہوئے گمراہ چھوڑ گیا تھا۔ اس وقت مندا دیوی نے یلماس کو ایک اہم مثورو دیا۔ یلماس آگے بڑھا اور اپنی ماں کے عشقاق سے درخواست کی کہ جو اس کمان کو کھینچ لے گا ملک پہنچنے لوپیا اس کے ساتھ شادی رچانے پر تیار ہے۔ ملک نے اپنے بیٹے کی بات کو سن کر جمع عشقاق میں جلوہ افروز ہوتے ہوئے بیٹے کی بات کی تائید کی اور محل کی سیڑھیاں چڑھنے لئے اوڈسیوس کی کمان جمع عشقاق میں لائی گئی۔ سب سے پہلے انیشور نے زور آزمائی کی، پھر یوریماکس نے زور آزمایا مگر کمان خم نہ ہوئی۔ یکے بعد دیگرے تمام عشقاق ناکام رہے۔ اس موقع پر اوڈسیوس نے زور آزمائی کی اجازت طلب کی۔ اس پر لی الغور ایک آوازہ تحریر بلند ہوا، لیکن یلماس اجازت دے چکا تھا۔

اوڈسیوس نے دروازے متھل کرو دیئے اور ایک تیر اٹھا کر کمان میں ہوڑا۔
بلیماکس کر سے ٹکوار لٹکائے اور ہاتھ میں بر جھی تھاے آگے بڑھا۔ اوڈسیوس کے پتے
پرانے جو تھے اس کے جسم پر سے گر پڑے اور وہ شاہانہ جاہ و جلال کے ساتھ ظاہر
ہوا۔ اوڈسیوس نے آک کر نشانہ لیا اور تیر ایشوس کے حلق سے پار ہو گیا۔ سب حیران
ہو کر ہتھیار اٹھانے کو بچپنے لیکن اس موقع پر مندوا دیوی نے انہیں انداھا کر دیا۔
بلیماکس اور اوڈسیوس کشتوں کے پتے لگا رہے تھے اور مندوا دیوی ایک بڑے
پرندے کی صورت میں ان کے سروں پر منڈلا رہی تھی۔

محل کے اندر جب خدام نے پینے لوپا کو یہ نوید سنائی کی اوڈسیوس والپس آگیا
اور سارے عشاق قتل ہو گئے تو اسے یقین نہ آیا۔ تھوڑی دیر بعد جب اوڈسیوس اپنے
پتے کے ہمراہ پینے لوپا کے سامنے آیا تو وہ تصویر کی مانند بت بی کھڑی رہی۔ اسے تو
بات تک کرنے کا یارا نہ تھا۔

بلیماکس نے آگے بڑھ کر اس کی سرد مری پر سخت سست کما تو اسے ناچار اپنی
آنکھوں پر یقین کرنا ہی پڑا۔ تب وہ دوڑ کر آئی اور اوڈسیوس کے گلے لگ گئی۔ پھر کتنے
گلی۔

”اے بیرے سرتاج مجھے معاف کر دیتا۔ دیو مااؤں نے ہم کو ایک دوسرے سے دور رکھ کر
مجھ میں سرد مری اور رکھاوت پیدا کر دی۔ اگر یینیڈوس کی یہوی تبلیغ میری نسبت
نصف احتیاط بھی بر تی تو ہم سب ان مصائب سے بچ رہتے۔“

پینے لوپا کی ان باتوں نے اوڈسیوس کے دل میں اس کی محبت کو اور بڑھا دیا۔
تب اسے کرکی اور کلپس کی غیر قابلی محبت کے مقابلے میں اپنی یہوی پر کہیں زیادہ فخر
محصور ہوا۔ ایسے میں اچھی دیوی نے اس کے بوڑھے تن میں جوان مردی کی روشن
پھونک دی۔ اب وہ پھر سے جوان ہو گیا تھا۔

اہل ایکا نے اپنے محبوب اوڈسیوس کے پلٹ آنے کی خوشی میں دیو مااؤں کو
قریانیاں گزرانیں اور دھوم دھام سے جشن منایا۔



آن کمی داستان کشمیر

کے مصنف حکومت آزاد جموں و کشمیر کے سابق وزیر قاؤن

ڈاکٹر سلام الدین نیاز

کی نئی معرکہ الاراد تصنیف

آرٹ خ حُریت کشمیر

ایک ایسی جامع کتاب جیسیں

اولاً — مسئلہ کشمیر کو معنوی ربط کیسا تھا پیش کیا گیا ہے

ثانیاً — پاکستانی نقطہ نظر کی تھا بھارتی موقف کا تنقیدی حائزہ

بھی شامل ہے

ثالثاً — مسئلہ کشمیر کے تمام اہم پہلوؤں کا بھروسہ حوالہ موجود ہے

رابعاً — مصنف کا اندازہ بیان جذباتی نہیں معروضی ہے

۲۵۳ صفحات، سفید کاغذ
مجلد دیدہ زیب ایڈیشن قیمت ۵۰۰ روپے

کلاسیک (چوکِ گل) دی مال لاہور... ۵۳۷

گیلپ ٹینڈر نوٹس

مکالمہ کے مختصر شدہ نہیں کیدا ہوں سے جنہوں نے دو ماہ میں سال ۱۹۹۵ء کے لئے اپنے ہموں کی تجدید کر لی ہو لور تھہڑی فیس جمع کروادی ہو درج ذیل کاموں کے لئے کپوزٹ شینڈل آف ریٹ ۱۹۷۹ء سے فیصلہ کم / زیادہ کی نہیں پر سر بکر ٹینڈر مطلوب ہیں ہر ٹینڈر کی بیانات میں کے آگے درج ہے ہر ٹینڈر کے ہمراہ تخفیفی لائگت کا ۲۰٪ فیصلہ زر خلافت کی شینڈل بک کی اپلاٹ ایٹ کال کی حکمل میں زیرِ دفعہ کے ہم ٹینڈر کے ساتھ مسلک ہونا ضروری ہے سکھاں والی کوہڑی سے کیرن جو صرف اسی صورت میں شروع گی جلوے گی جب تعلق ہینڈ میں رقم دستیاب ہو جلوے گی کام منظوری کے پھر دو یام کے اندر فتح کر دیا گا پھر کی مقدار میں موقع کی منابت سے کی بیشی ہو سکتی ہے شرودا اور ملٹل ٹینڈر ناقابل مختار ہوں گے ٹینڈر کی منظوری مجاز حاکم کے تابع ہو گی جو ٹینڈر کو بغیر وجہ تائے ہا منظور کرنے کا حق منظور کرتا ہے ٹینڈر قدم موخر ۱۶، ۷، ۹۵ ملک دفتری لوگات کے دوران فروخت کے جائیں گے اور موخر ۱۳، ۷، ۹۵ کو دن ۱۲ بجے تک کیدا لعل کی موجودگی میں کھولے جائیں گے جو اس دن موقع پر موجود ہوں گے ہر کام کی ادائیگی فتنڈر دستیاب ہونے پر کی جلوے گی سیریل نمبر ۵، ۱۰۰۷۴ پر مکروہ کام موقع کی منابت سے کرنا ہوں گے اور کام کی ادائیگی فتنڈر دستیاب ہونے پر کی جائیں گی۔

ٹینڈر قدم حاصل کرنے کے خواہ شدہ نہیں کیدا اپنے ہموں کی تجدید کے بالے میں اصل خط اور اوجیل فیس کی دیرہ ہر چہ لائیں اور پردیشی تکمیل کی ادائیگی کا شرطیت بھی ہمراہ لائیں بصورت دیگر قدم جدی نہیں کیا جائیگا۔

نبرٹلڈ ہم کم

مقدار تخمینہ لائت زرہات میعاد تجیل

۱۔ چھر کی رنج سکھ توپی کوٹھی سے جدر آکہ
پر بھک (فحلہ تقریباً ۱۰۸ میل)

۲۔ چھر کی رنج سکھ توپی کوٹھی سے سید
والد بھک (فحلہ تقریباً ۸۹ میل)

۳۔ چھر کی رنج سکھ توپی کوٹھی سے کندھاں
لور کندھم شہ بھک (فحلہ تقریباً ۹۰ میل)

۴۔ چھر کی رنج سکھ توپی کوٹھی سے طاں
خون بھک (فحلہ تقریباً ۱۱۸ میل)

۵۔ جدر آکہ پرے فلڈ سین ۱۹۹۵ء کے
دوران فلڈ فائرنگ کرنا

۶۔ کندھاں لور کندھم شہ پرے فلڈ سین
۱۹۹۵ء کے دوران فلڈ فائرنگ کرنا

۷۔ سید والاد پرے فلڈ سین ۱۹۹۵ء کے
دوران فلڈ فائرنگ کرنا

عنائت اللہ چیسہ

ایکسین فلڈ بند ڈویرن لاہور

آلی پی ایل - ۵۶۰۸